بالائے ستم
علیم الحق حقی

وہ ارم ہوٹل کے کمرا نمبر332 میں ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسکرین پر شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی نظر آ رہے تھے۔ یہ ایک اسپتال کے افتتاح کی تقریب تھی جس میں شاہ مہمان خصوصی تھے' لیکن اسے شہنشاہ کو دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اسی لئے اس کی نظریں اسکرین پر نہیں تھیں۔ وہ تو امروز نامی ٹاک شو کا منتظر تھا۔

اس نے چھ بجے کا الارم لگایا تھا لیکن وہ اس سے پہلے ہی بیدار ہو گیا تھا۔ ہوا بے حد سرد اور بے حد تیز تھی۔ وہ کھڑکیوں کے پٹ کھڑکھڑا رہی تھی۔ ایسے میں کوئی سو سکتا ہے بھلا؟ اور پھر اس کی نیند..... وہ تو گہری اور اچھی تھی بھی نہیں۔

پھر امروز شروع ہو گیا لیکن اس نے ٹی وی کی آواز اب بھی نہیں کھولی۔ اسے خبروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو بس انٹرویو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کرسی پر بے چین بیٹھا رہا۔ کبھی وہ ایک ٹانگ دوسری پر رکھ لیتا اور کبھی ہٹا لیتا۔ صبح اس نے شیو بنایا تھا اور نہا بھی لیا تھا۔ اس وقت وہ پولیسٹر کا وہی گرین سوٹ پہنے ہوئے تھا' جسے پہن کر وہ ہوٹل میں آیا تھا۔ جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ اس کا دن آ پہنچا ہے' اس کے ہاتھ کپکپانے لگے تھے اور اس کے ہونٹ پر کٹ لگ گیا تھا۔ اچھا خاصا خون بھی نکلا تھا۔ شیو کرنے کے بعد بھی اسے اپنی زبان پر خون کا ذائقہ محسوس ہوتا رہا تھا..... اور اسے چکر آنے لگے تھے۔

خون سے اسے نفرت تھی!

اسے یاد تھا' گزشتہ رات ڈیسک کلرک نے ناقدانہ نظروں سے اس کے لباس کا جائزہ لیا تھا۔ کوٹ اس نے ہاتھوں پر لے رکھا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کوٹ بوسیدہ نظر آنے لگا ہے لیکن سوٹ نیا تھا۔ اس کے لئے اس نے بچت کی تھی۔ اس کے باوجود کلرک کی نگاہوں کا تاثر بتاتا تھا کہ وہ اسے معزز نہیں لگا ہے۔

"آپ کے پاس ریزرویشن ہے؟" ڈیسک کلرک نے پوچھا تھا۔

یہ کسی اچھے ہوٹل میں آنے کا اس کا پہلا موقع تھا لیکن اس نے اس کے لئے ریہرسل کر لی تھی "ہاں... میرے پاس ریزرویشن ہے۔" اس نے پراعتماد سرد لہجے میں کہا تھا۔

ڈیسک کلرک ڈول گیا کہ شاید اس سے اندازے کی غلطی ہو رہی ہے "آپ دو سو تومان جمع کرا دیں۔ کریڈٹ کارڈ تو ہو گا آپ کے پاس؟"

"نہیں۔ میں نقد ادائیگی کروں گی۔"

اس پر کلرک کے چہرے پر پھر وہی تاثر لوٹ آیا تھا۔

"میں بدھ کی صبح چیک آؤٹ کروں گی۔" اس نے بے پروائی سے کہا تھا۔

تین راتوں کے لئے کمرے کا کرایہ ایک سو چالیس تومان تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاس صرف دو سو ساٹھ تومان بچیں گے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اس کے لئے بہت کافی تھے اور پھر بدھ کے روز تو اس کے پاس تگڑی رقم آ ہی جائے گی۔ تین لاکھ اٹھائیس ہزار تومان... تگڑی رقم!

وہ خوب صورت چہرہ اس کے تصور میں لہرا گیا۔ اس نے اسے دیکھنے کے لئے بار بار پلکیں جھپکیں کیونکہ ہمیشہ کی طرح وہ بڑی بڑی چراغوں جیسی روشن آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ جیسے اس کے وجود کے آرپار دیکھ رہی تھیں۔

ایک کمرشل ختم ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دلچسپی کا تاثر ابھرا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر والیوم کی ناب گھمائی۔ انٹرویو شروع ہونے والا تھا۔

پھر امروز کے میزبان انور شیرازی کا جانا پہچانا چہرہ اسکرین پر ابھرا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی بجھا بجھا تھا "سزائے موت کی بحالی کا مسئلہ آج کا سب سے بڑا جذباتی مسئلہ... بلکہ تنازعہ بن چکا ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ عوام کی اکثریت سزائے موت کے حق میں ہے یا خلاف ہے۔ بہرحال اب سے 52 گھنٹے بعد، 24 فروری کو ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے صبح اس سال کی چھٹی سزائے موت پر عمل درآمد ہونے والا ہے۔ انیس سالہ جواد اصغر کو پھانسی دے دی جائے گی۔ میرے آج کے مہمان..."

کیمرا دائیں جانب موو ہوا اور ایک مرد اور عورت اسکرین پر نظر آئے۔ مرد کے

کندھے بہت چوڑے تھے۔ عمر بتیس تینتیس کے لگ بھگ ہو گی لیکن کنپٹیوں پر اس کے بالوں میں سفیدی چمک رہی تھی، جس کی وجہ سے وہ بے حد باوقار لگ رہا تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سپید اور آنکھیں نیلی تھیں۔

اس کے ساتھ جو عورت تھی، اس کے جسم کا تناؤ اسکرین پر بھی صاف نظر آ رہا تھا مگر وہ تھی بہت حسین۔ اس کے بال شہد رنگ تھے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کیا اور پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے اوپر کیا۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں رکھے تھے اور دونوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ نروس ہے۔

کیمرا پھر انور شیرازی پر آیا "میرے یہ دونوں مہمان چھ ماہ پہلے میرے پروگرام میں اسی موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں۔" اس نے کہا۔ "اور دونوں نے نہایت مدلل انداز میں اپنا اپنا کیس پیش کیا تھا۔ دونوں کا کیس بہت مضبوط تھا۔ میں پھر تعارف کرا دوں۔ شیریں پاشا مشہور کالم نویس ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی کتاب... سزائے موت۔ انصاف کے نام پر بے انصافی... بے حد مقبول ہوئی۔ اس کے اب تک اٹھارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف کمال آفندی ہیں... کثیرالاشاعت روزنامے طلوع کے مدیر۔ سزائے موت کے حق میں بلند ہونے والی سب سے موثر آواز انہی کی ہے۔"

انور شیرازی کے لہجے میں جان پڑنے لگی۔ وہ کمال آفندی کی طرف مڑا "آقائے آفندی۔ تازہ ترین سزائے موت پر عوامی رد عمل دیکھنے کے بعد بھی آپ اپنے موقف پر قائم ہیں... یعنی آپ کے خیال میں سزائے موت انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ضروری ہے؟"

کمال آفندی نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا "بالکل ضروری ہے۔ میں اس پر پوری سچائی کے ساتھ یقین رکھتا ہوں۔"

انور شیرازی شیریں پاشا کی طرف مڑا "جی شیریں پاشا۔"

شیریں تھکن سے چور تھی۔ گزشتہ ماہ وہ بغیر کسی چھٹی کے بیس گھنٹے یومیہ کام کرتی رہی تھی۔ اس نے سزائے موت کے خلاف زبردست لابنگ کی تھی۔ وہ بارسوخ لوگوں سے ملی تھی۔ ججوں سے، وکلا سے۔ اس نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں خطاب

کیا تھا۔ اس نے سب سے التجا کی تھی کہ وہ گورنر کو لکھیں.... جواد اصغر کی سزائے موت کے خلاف احتجاج کریں۔ ہر جگہ اس کی پذیرائی ہوئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ گورنر رحم کی اپیل پر نظر ثانی ضرور کرے گا.... عوام و خواص کا دباؤ معمولی نہیں تھا۔ یہ الگ بات کہ ملک میں شہنشاہیت تھی اور فیصلہ فرد واحد کے ہاتھ میں تھا۔

"میں سمجھتی ہوں کہ سزائے موت کی بحالی کے ذریعے ہم نے ماضی بعید کے تاریک دور کی طرف ایک بڑی طویل جست لگا دی ہے۔" وہ بولی پھر اس نے اپنے پہلو میں رکھے ہوئے اخبار اٹھا کر لہرائے "ان اخباروں کی شہ سرخیاں میری بات کا ثبوت ہیں۔ یہ دیکھیں.... لعنتی قاتل معصومیت کا دعوے دار ہے اور یہ دیکھیں..... انیس سالہ قاتل بدھ کی صبح کیفر کردار تک پہنچے گا.... یہ تمام سرخیاں اسی طرح کی ہیں.... خون آشام.... وحشیانہ.... تشددانہ.... یہ کسی مہذب معاشرے کی نہیں لگتیں۔" اس کی آواز بکھر گئی۔

کمال آفندی نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ انہیں ابھی ذرا دیر پہلے اطلاع ملی تھی کہ گورنر نے پریس کانفرنس بلائی ہے، جس میں وہ اعلان کرنے گا کہ اس نے جواد اصغر کی سزائے موت پر عمل درآمد روکنے کی درخواست مسترد کر دی ہے۔ اس خبر نے شیریں کو بے حد مایوس کیا تھا۔ انہیں آج یہاں اس شو میں آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ شیریں کی مایوسی اپنی جگہ درست تھی۔ اس نے سزائے موت کے خلاف جو کچھ کیا تھا، سب رائیگاں ہو گیا تھا۔ کمال تو خود بھی اس شو میں شرکت نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ پہلے سے مدعو تھے اور اب وہ آیا تھا تو اسے بولنا بھی تھا۔

"میرا خیال ہے، ہر اچھا انسان سزائے موت کی اہمیت سمجھتا ہے اور اس کی ضرورت بھی محسوس کرتا ہے۔" اس نے کہا "اور یہ بھی یاد رکھیں کہ سزائے موت یونہی نہیں دے دی جاتی۔ فیصلہ سنانے والے بہت غور و خوض کے بعد جب ملزم کو سزائے موت کا مستحق سمجھ لیں، تبھی یہ سزا سناتے ہیں۔ یہ کوئی سرسری اور عاجلانہ فیصلہ نہیں ہوتا۔"

"جواد اصغر نے اپنی سترھویں سالگرہ کے صرف چند روز بعد قتل کا ارتکاب کیا تھا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اسے وہ سزا ملنی چاہئے جو اس جرم میں عاقل و بالغ مردوں کو

دی جاتی ہے؟" انور شیرازی نے پوچھا۔

"آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں خاص طور پر اس فیصلے پر تبصرہ نہیں کر سکتا۔ یہ نامناسب ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں آقائے آفندی، لیکن سزائے موت کے بارے میں آپ کا موقف برسوں پرانا ہے...." شیرازی کہتے کہتے رکا "یہ اس کے کئی برس بعد کی بات ہے کہ جواد اصغر نے آپ کی بیوی کو قتل کیا۔"

نازنین کے قتل کو ڈھائی سال ہو چکے تھے لیکن کمال کو اس کے قتل کے متعلق سوچ کر اب بھی بے یقینی ہوتی تھی.... اور پھر اشتعال پیدا ہوتا تھا۔ اس کی زندگی سے بھرپور، حسین بیوی کو ایک مداخلت کار نے اس کے گھر میں گھس کر اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا.... اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ یہ بات اب بھی اسے ناقابل یقین لگتی تھی۔

اس نے نازنین کے تصور کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا "اپنے اس ذاتی المیے سے برسوں پہلے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اگر ہمیں چادر اور چار دیواری کے تحفظ کا خیال رکھنا ہے، اگر ہمیں بلا خوف کہیں جانے آنے کی آزادی قائم کرنی ہے تو ہمیں تشدد کے پیروکاروں کی بیخ کنی کرنی ہو گی۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس قاتلوں کو باز رکھنے کے لئے اس کے سوا کوئی موثر دھمکی نہیں کہ انہیں بھی انجام کار وہی سزا ملے گی، جو انہوں نے مقتول کو دی ہے.... موت.... تشددانہ موت! اور آپ دیکھ لیں کہ دو سال پہلے سزائے موت بحال کی گئی.... اور اس کے بعد بڑے شہروں میں قتل کی وارداتوں کی شرح میں ڈرامائی طور پر بہت زیادہ کمی واقع ہوئی ہے۔"

شیریں آگے کی طرف جھکی "آپ کو احساس ہے کہ 45 فیصد قاتل پچیس سال سے کم عمر ہوتے ہیں، وہ عام طور پر المناک خاندانی پس منظر کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ نفسیاتی مسائل ہوتے ہیں.... اور وہ بھی متنوع اور پیچیدہ...."

ارم ہوٹل کے کمرا نمبر 332 کا مہمان شیریں کو پرخیال نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ عورت تھی، جس میں کمال آفندی بہت زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ کسی اعتبار سے بھی اس کی مقتول بیوی جیسی نہیں تھی۔ یہ دراز قامت اور خوش بدن تھی لیکن اس کا

جسم کسرتی تھا جبکہ مقتول بیوی ایک گڑیا جیسی تھی۔ چھوٹی' دبلی پتلی مگر متناسب الاعضا۔

شیریں کی سبز آنکھوں میں نیلگوں جھلک تھی۔ انہیں دیکھ کر اسے سمندر کا خیال آتا تھا۔ اس کی ذہنی رو بھٹکنے لگی۔ ایران ایک آزاد خیال ملک تھا مگر وہ یہاں بھی محروم تھا۔ وہ کسی عورت کی طرف بڑھتا تو وہ بھڑک جاتی۔ حالانکہ وہ خوش شکل بھی تھا اور پرکشش بھی....

وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ کمال آفندی کچھ کہہ رہا تھا.... کیا کہہ رہا تھا....؟

"میں مقتولین کی موت کا دکھ کرتا ہوں۔ قاتلوں کا نہیں۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔" کمال کہہ رہا تھا۔

"میری ہمدردیاں بھی مقتولین کے ساتھ ہیں۔" شیریں کی آواز بلند ہو گئی "لیکن مجھے یہ بتائیے کہ کیا جواد اصغر جیسوں کے لئے عمر قید کی سزا کافی نہیں۔" وہ ایک بار پھر بھول گئی تھی کہ اس وقت وہ کیمرے کے سامنے ہے۔ وہ بس کمال کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی "تم جو اتنے درد مند اور نرم دل آدمی ہو' خدا بننے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟"

یہ مباحثہ چھ ماہ پہلے بھی اسی طرح شروع ہوا تھا.... اور اسی طرح ختم ہوا تھا۔ چھ ماہ پہلے' اسی پروگرام میں۔ آخر میں انور شیرازی نے کہا "تو آقائے آفندی' آپ سمجھتے ہیں کہ سزائے موت کے نفاذ کی وجہ سے قتل کی وارداتوں میں کمی ہوئی ہے۔ اس لئے آپ سزائے موت کو جائز سمجھتے ہیں؟"

"دیکھئے۔ میں اخلاقی حقوق پر یقین رکھتا ہوں۔ معاشرے کا فرض ہے کہ وہ اپنا تحفظ کرے اور یہ حکومت کا بھی فرض ہے کہ وہ عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لئے تمام ضروری اقدامات کرے۔"

"اور خاتون شیریں' آپ کیا فرماتی ہیں؟"

"میں سزائے موت کو احمقانہ اور بے رحمانہ سمجھتی ہوں۔ میرے نزدیک یہ وحشیانہ عمل ہے۔ میرے خیال میں تشدد کا رجحان رکھنے والوں کو سزائے قید کے ذریعے... اور جدید طرز کے اصلاح گھروں کی مدد سے سدھارا جا سکتا ہے اور یوں چار دیواری کو تحفظ فراہم کیا جا سکتا ہے۔ انسانی جان ایک مقدس چیز ہے۔ ہمیں اصلاح کے

نام پر کسی مجرم کو بھی اس سے محروم کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ تقدس انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔"

"آپ دونوں کا بہت شکریہ کہ آپ یہاں تشریف لائے اور اس پروگرام کو رونق بخشی۔ اس کے ساتھ ہی میں اجازت چاہتا ہوں۔"

○

ارم ہوٹل کے کمرا نمبر 332 میں ٹی وی بند کر دیا گیا تھا۔ وہ بیٹھا تاریک اسکرین کو گھورے جا رہا تھا۔ ایک بار پھر وہ اپنے منصوبے کی جزئیات کو ذہن میں تازہ کر رہا تھا۔ منصوبے کا نکتہ آغاز یہ تھا کہ اسے تصویروں کو اور سوٹ کیس کو تہران کے سینٹرل ریلوے اسٹیشن کے خفیہ کمرے میں پہنچانا تھا۔ اگلے مرحلے میں اسے کمال آفندی کے بیٹے جلال کو وہاں لے جانا تھا مگر اب وہ ایک اور فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ آج شیریں پاشا' آفندی کے بیٹے کو کمپنی دینے کی غرض سے اس کے ساتھ ہو گی۔ ان دونوں کو گھر میں اکیلے ہونا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ شیریں کو وہیں ختم کر دے گا لیکن اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ تو زیاں ہو گا۔ وہ اتنی خوب صورت ہے اور جب وہ کیمرے کو دیکھ رہی تھی تو اسے لگا تھا کہ وہ براہ راست اسے دیکھ رہی ہے۔ جیسے وہ اسے بلاوا دے رہی ہے۔ کون جانے' وہ اس سے محبت کرتی ہو پھر اتنی خوب صورت چیز کا ضائع کرنا....! اور اگر وہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی تو بھی اس سے پیچھا چھڑانا کچھ مشکل نہیں ہو گا۔ وہ اسے بدھ کی صبح ساڑھے گیارہ بجے آفندی کے بچے کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کے اس خفیہ کمرے میں چھوڑ دے گا۔ ساڑھے گیارہ بجے بم پھٹے گا تو وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کے چیتھڑے اڑ جائیں گے' جو ہرگز خوبصورت نہیں ہوں گے!

○

وہ اسٹوڈیو سے ساتھ نکلے۔ شیریں کے ہاتھ اور پاؤں بری طرح ٹھٹھر رہے تھے۔ اس نے بڑی احتیاط سے دستانے کو حجرالقمر کی اس انگوٹھی کے اوپر چڑھایا' جو کمال نے عید پر اسے تحفے میں دی تھی۔ وہ باہر نکلے تو برف باری ہو رہی تھی "میں تمہارے لئے ٹیکسی روکتا ہوں۔" کمال آفندی نے کہا۔

"نہیں۔ میں کچھ دیر پیدل چلنا چاہتی ہوں۔ دماغ پر بہت بوجھ ہے۔ ہلکا ہو جائے گا۔" وہ کہتے کہتے رکی اور اس نے کمال کو بھرپور نظروں سے دیکھا "کمال.... تم اتنے ہٹ دھرم کیوں ہو۔ سمجھ دار ہوتے ہوئے بھی اتنے ضدی....!"

"جانم.... دوبارہ بحث مت شروع کرو۔" کمال نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ برف شیریں کے رخساروں پر پگھل رہی تھی۔ وہاں روشنی ہی روشنی تھی "اب تم گھر جاؤ اور کچھ دیر آرام کر لو۔"

"مجھے اپنا کالم بھی بھجوانا ہے۔" شیریں نے کہا۔

"چند گھنٹے کی نیند بھی لے لینا۔ تمہیں پونے چھ بجے تک میرے گھر پہنچنا ہوگا۔"

"کمال.... مجھے یقین نہیں ہے...."

"مجھے ہے۔" کمال نے جلدی سے کہا "دیکھو' آج آفاق اور سائرہ کی شادی کی سالگرہ ہے۔ وہ جائیں گے اور میں چاہتا ہوں کہ آج رات اپنے گھر میں تمہارے اور جلال کے ساتھ گزاروں۔"

شیریں خاموشی سے چلتی رہی۔ فٹ پاتھ پر اچھا خاصا ہجوم تھا۔ کمال نے راہ گیروں کی پروا کئے بغیر رک کر شیریں کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا اور اوپر اٹھایا "شیریں جانم' میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا "ہمیں اس سلسلے میں بھی بات کرنی ہے۔"

"لیکن کمال' ہمارے سوچنے کا انداز بہت مختلف ہے۔ ہمارے درمیان ہم آہنگی نہیں ہے۔ ہم...."

کمال نے اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے لبوں سے لگا لیا پھر اس نے سیدھے ہوتے ہوئے قریب سے گزرنے والی ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی رکی تو اس نے بڑھ کر شیریں کے لئے عقبی دروازہ کھولا۔ "تو آج رات کے لئے اچھی امید رکھوں نا؟" اس نے کہا۔

شیریں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھی۔ کمال نے دروازہ بند کیا....

اور ٹیکسی چل دی۔

شیریں کو رخصت کرنے کے بعد کمال آفندی پیدل ہی چلتا رہا۔ وہ رات کو ہوٹل میں ٹھہرا تھا کیونکہ صبح ساڑھے چھ بجے اسے اسٹوڈیو پہنچنا تھا اور سمنان میں' اپنے گھر

سے اسٹوڈیو آنا اس کے لئے دشوار تھا۔ اب اسے یہ فکر تھی کہ اسکول جانے سے پہلے جلال سے فون پر بات کر لے۔ وہ گھر سے دور ہوتا تو بیٹے کے لئے فکر مند رہتا تھا۔ جلال اب بھی ڈراؤنے خواب دیکھتا تھا.... اور ایسے میں وہ جاگتا تو اس کا دم گھٹ رہا ہوتا' سانسیں اکھڑ رہی ہوتیں۔ اس پر دمے کا دورہ پڑتا تھا۔ جب بھی ایسا ہوتا' سائرہ اس کی ہدایت کے مطابق فوراً ہی ڈاکٹر کو فون کر دیتی تھی لیکن پھر بھی....

اور جلال بہت کمزور ہو گیا تھا۔ سردی بہت تھی۔ شاید موسم بہار میں وہ کچھ بہتر ہو جائے۔ موسم بہار بھی آنے والا ہے۔ ایک مہینے کی بات تو ہے۔'

پھر وہ شیریں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان کی پہلی ملاقات کو چھ ماہ ہو چکے تھے۔

اسے یاد آیا' جب وہ پہلی بار اسے کھانے پر لے جانے کے لئے لینے اس کے گھر پہنچا تھا تو اس نے گاڑی میں چلنے کے بجائے پیدل چلنے کی فرمائش کی تھی "ہم پہلوی پارک میں سے ہو کر چلیں گے۔ مجھے پیدل چلنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

ہوا میں اچھی خاصی خنکی تھی۔ کمال نے کہا تھا "دیکھو.... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈ بڑھ جائے گی۔ موسم بدل چکا ہے۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ مجھے گرمی اچھی نہیں لگتی۔"

وہ چلتے رہے۔ خاصی دیر تک خاموشی رہی۔ کمال اس کی چال دیکھتا رہا۔ وہ بڑے ہموار انداز میں اس کے قدم بہ قدم چل رہی تھی۔ اسے بہت اچھا لگا۔

اور وہ وقت بہت اچھا گزرا۔ دونوں نے کھانا کھانے میں دیر لگائی' جیسے زیادہ سے زیادہ وقت ساتھ گزارنا چاہتے ہوں۔ کھانے کے دوران میں وہ باتیں کرتی رہی۔ شیریں کے والد آئیل کمپنی میں انجینئر تھے۔ اس کی دو بہنیں اور تھیں۔ دونوں بڑی تھیں اور دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔

"تو آپ اب تک کیسے بچی ہوئی ہیں شیریں؟" اس نے پوچھا تھا۔

شیریں سمجھ گئی کہ وہ کیا پوچھ رہا ہے۔ یہی کہ اس کی زندگی میں کوئی مرد ہے یا نہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ شیریں کی زندگی کے ایوان میں اس وقت تک کوئی مرد قدم نہیں رکھ سکا تھا۔ کالم لکھنے سے پہلے وہ ایک روزنامے سے منسلک تھی اور زیادہ تر وقت سفر میں رہتی تھی۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس کی

زندگی کے سات برس کیسے گزر گئے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا۔

پھر وہ اسے اس کے اپارٹمنٹ چھوڑنے کے لئے گیا۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے۔ وہ اصرار کر کے اسے اپنے اپارٹمنٹ میں لے گئی "میں آپ کو کافی پلا سکتی ہوں۔ شراب میں کم ہی پیتی ہوں اور گھر میں تو رکھتی ہی نہیں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔"

شیریں نے آتش دان دہکایا اور پھر کافی بنانے کے لئے کچن میں چلی گئی۔ وہ بیٹھا آتش دان میں رقص کرتے شعلوں کو دیکھتا رہا پھر کافی لا کر شیریں بھی اس کے پاس آ بیٹھی۔ کمال کو اب بھی یاد تھا کہ آتش دان کی نارنجی روشنی میں وہ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ جادوئی تھی۔ وہی اسے لپٹانے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا لیکن رخصت ہوتے وقت اس نے اس کا ہاتھ چومنے پر اکتفا کیا "ہفتے کو تم مصروف تو نہیں ہو؟" اس نے پوچھا۔ اتنی دیر میں ان کے درمیان بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔

"نہیں۔ کوئی مصروفیت نہیں ہے۔"

اپنے گھر واپس آتے ہوئے کمال کو احساس ہو رہا تھا کہ دو سال پرانی بے چینی اور دل کی بے سکونی ختم ہونے والی ہے۔

جس بلڈنگ میں اس کے اخبار کے دفاتر تھے، اس کے سامنے پہنچ کر وہ چونکا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا آٹھ بجے تھے۔ وہ بلڈنگ میں داخل ہوا۔ کوریڈور سنسان تھے۔ اس نے سیکیورٹی گارڈ کے سلام کا جواب دیا اور لفٹ میں بیٹھ کر آٹھویں منزل پر پہنچا، جہاں اس کا آفس تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے سائرہ کی آواز سنائی دی "جلال کیسا ہے؟" کمال نے پوچھا۔

"جی ٹھیک ہے۔ ناشتا کر رہا ہے۔ جلال.... تمہارے بابا جانی کا فون ہے۔"

اگلے ہی لمحے ریسیور پر جلال کی آواز ابھری۔ "سلام علیکم بابا جانی۔ آپ گھر کب آئیں گے؟"

"ساڑھے آٹھ بج تک پہنچ جاؤں گا۔ پانچ بجے میری میٹنگ ہے۔ یہ لوگ تو فلم دیکھنے جائیں گے نا؟"

"جی بابا... شاید یہی پروگرام ہے ان کا۔"

"شیریں چھ بجے سے پہلے گھر پہنچ جائیں گی۔ تاکہ یہ دونوں جا سکیں۔"

"جی بابا جانی، آپ نے بتایا تھا۔ مجھے یاد ہے۔" جلال کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹے۔ خوش رہنا اور ہاں، گرم کپڑے پہننا۔ سردی بہت ہے پھر رات کو میں آؤں گا تو خوب باتیں کریں گے۔"

"خدا حافظ بابا جانی۔"

ریسیور رکھنے کے بعد کمال کے چہرے پر اضطراب ابھرا۔ اسے یاد تھا۔ نازنین کی موت سے پہلے اس کا بیٹا کتنا شریر تھا، کتنا خوش مزاج اور متحرک تھا۔ اب وہ سوچتا تھا کہ کاش جلال، شیریں سے بے تکلف ہو جائے۔ اسے قبول کر لے۔ شیریں بھرپور کوشش کر رہی تھی کہ وہ خول توڑ دے، جس میں جلال نے خود کو بند کر رکھا ہے لیکن جلال اسے ناکام بناتا آ رہا تھا۔

وقت! کمال نے آہ بھر کر سوچا۔ ہر کام میں وقت لگتا ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں کہاں جمتی ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ اداریہ اٹھا لیا جس پر وہ رات کام کرتا رہا تھا۔

○

کمرا نمبر 332 کا مہمان صبح ساڑھے نو بجے اپنے کمرے سے نکلا۔ سڑک پر چلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ ہمیشہ جیسی پرہجوم نہیں ہے۔ لوگ کم ہی نظر آ رہے تھے اور جو تھے، وہ بھی بھاگنے کے انداز میں تیز تیز چل رہے تھے۔ برف باری کے بعد کی سرد ہوا جیسے انہیں دوڑا رہی تھی۔ یہ موسم اس لئے بے حد مناسب تھا۔ ایسے میں لوگوں کو دوسروں کو دیکھنے اور ان کے متعلق تجسس کرنے کا خیال بھی نہیں آتا۔ کسی کو پروا نہیں ہوتی کہ دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں۔

پرانے کپڑوں کی دکان پر وہ اس طرف بڑھا، جہاں خواتین کے کوٹ رکھے تھے۔ پرانے کپڑوں کو ٹٹولتے ہوئے اس نے گرے کلر کا ایک ٹینٹ نما اونی کوٹ منتخب کیا، جو دیکھنے میں کافی لمبا لگ رہا تھا پھر وہ تہہ کئے ہوئے اسکارف کی ٹرے کی طرف گیا۔ اس نے خاص طور پر وہ اسکارف منتخب کیا، جو سب سے بڑا تھا۔ وہ نیلے رنگ کا تھا۔ کہیں کہیں سے رنگ اڑ رہا تھا۔ سیلز مین نے دونوں چیزیں شاپنگ بیگ میں رکھ کر اس کی

طرف بڑھائیں۔

اس کے بعد اس نے آرمی نیوی اسٹور سے کینوس کا ایک بڑا بیگ خریدا پھر وہ ایک میڈیکل اسٹور میں گیا۔ وہاں سے اس نے سرجیکل ٹیپ کے تین بڑے اسپول' چوڑے بینڈیج کے چھ رول اور موٹی ڈوری کے دو بڑے اسپول خریدے۔ یہ سب چیزیں لے کر وہ دوبارہ ہوٹل چلا گیا۔

کمرے کا دروازہ مقفل کرنے کے بعد اس نے شاپنگ بیگ بیڈ پر رکھے پھر بڑی احتیاط سے اس نے اپنا دوہرے تالوں والا پرانا سیاہ سوٹ کیس الماری سے نکالا اور اسے بڑی نزاکت سے بیڈ پر لا کر رکھا۔ اپنے پرس سے چابی نکالنے کے بعد اس نے سوٹ کیس کا تالا کھولا اور سوٹ کیس کے اوپری حصے کو اٹھایا۔ اس نے سوٹ کیس میں رکھی چیزوں کو چیک کیا۔ تصویریں' پاؤڈر' کلاک' واٹر' فیوز' شکاری چاقو اور گن۔ مطمئن ہو کر اس نے دوبارہ سوٹ کیس بند کر کے اسے مقفل کر دیا۔

اس بار وہ کمرے سے نکلا تو اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس اور دوسرے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھے۔ اس بار وہ نچلی لابی میں گیا اور ان سیڑھیوں سے نیچے اترا' جو سینٹرل ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتی تھیں۔ اسٹیشن پر صبح جیسی گہما گہمی نہیں تھی پھر بھی لوگ ٹرینوں سے اتر رہے تھے.... اور جانے والی ٹرینوں میں سوار ہو رہے تھے۔ ریستوران اور نیوز اسٹینڈز بھی سنسان ہرگز نہیں تھے۔

یہ ایشیا کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن تھا' جسے نیویارک کے مشہور گرینڈ سینٹرل اسٹیشن کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ ہوائی اڈوں کے ٹرمینلز کی طرح اس کے بھی کئی لیول تھے... کئی منزلیں تھیں۔ وہ سب سے نچلے لیول کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ اس لیول پر ٹریک نمبر 112 تھا۔ وہاں سے زاہدان جانے والی ٹرینیں روانہ ہوتی تھیں اور آتی بھی تھیں۔ اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ کوئی سیکیورٹی گارڈ اسے نہ دیکھ پائے۔ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر گیٹ سے گزر گیا۔

پلیٹ فارم پر پہنچ کر وہ پٹڑیوں کے اختتام کے پاس حرف U کی ساخت کی جگہ کی طرف لپکا۔ گندے پانی کے پائپوں کے پاس سے گزر کر وہ ڈھلوان راستے سے اترنے لگا۔ یہ راستہ ٹرمینل کی گہرائی میں جاتا تھا۔ اب وہ بہت تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔

اوپر سے' سفر کرنے والوں کے آنے جانے کا دبا دبا شور سنائی دے رہا تھا۔ یہاں روشنی کم تھی اور آوازیں بھی مختلف تھیں۔ نیو ۔سنک پمپ کی آواز' اگیزھاسٹ پنکھوں کی آوازیں اور پانی ٹپکنے کی آوازیں۔ سرنگ میں بھوکی بلیاں بھی تھیں' جو کھانے کی تلاش میں ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔

وہ نیچے پہنچا۔ وہاں ایک آہنی زینہ تھا۔ وہ اس کے ذریعے اوپر چڑھنے لگا۔ پہلی لینڈنگ پر لوہے کا ایک بھاری دروازہ تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے سوٹ کیس اور شاپنگ بیگ نیچے رکھے' پھر چابی کے لئے اپنے بٹوے کو ٹٹولا۔ چابی کو کی ہول میں ڈالتے ہوئے وہ نروس تھا۔ تالا نہایت آسانی سے نہیں کھلا۔ بہرحال کھل گیا۔ اس نے دروازے کو دھکیل کر کھولا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ سیلن کی بو بھی اتنی شدید تھی کہ اسے برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ سوٹ کیس اور شاپنگ بیگ اندر لے گیا اور دروازے کو نہایت آہستگی سے بند کیا۔ اسٹیشن کے شور و غل کی آواز یہاں نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے طمانیت سے سر ہلایا۔ اس نے منصوبے کے پہلے مرحلے پر کامیابی سے عمل کر لیا تھا۔

اس نے سوئچ ٹٹولا اور اسے دبا دیا۔ کمرے میں ملگجی روشنی پھیل گئی۔ دودھیا روشنی کے بلب پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ روشنی سے کونوں میں گہرے سائے بن گئے تھے۔ وہ حرف L کی شکل کا کمرا تھا۔ دیواروں پر کافی پرانا گرے پینٹ تھا۔ دروازے کے بائیں جانب دو پرانے لانڈری ٹب تھے۔ دائیں جانب ایک کھلا ہوا دروازہ تھا۔ وہ ٹائلٹ کا تھا۔ ٹائلٹ استعمال کے قابل تھا۔ یہ وہ پہلے ہی چیک کر چکا تھا۔

وہ پچھلے ہفتے بیس سال بعد پہلی بار اس کمرے میں آیا تھا۔ اس نے آتے ہی لائٹ چیک کی تھی اور ٹائلٹ کا جائزہ لیا تھا۔

دور والی دیوار کے ساتھ ایک کینوس کا پلنگ تھا۔ پلنگ کے برابر نارنگیوں کا ایک خالی کریٹ پڑا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ درمیانی عرصے میں کوئی اور اس کمرے میں آیا... اور رہا ہے لیکن سیلن کی بو بتاتی تھی کہ مہینوں سے... بلکہ شاید برسوں سے اس کمرے کو کھولا نہیں گیا ہے۔

وہ اس کمرے میں بیس سال بعد آیا تھا۔ آخری بار وہ اس وقت یہاں آیا تھا' جب

وہ سولہ سال کا تھا۔ اب تو صدیوں پرانی بات لگتی تھی۔ ان دنوں یہ کمرا روشن ریستوران والوں کے استعمال میں تھا۔ یہ کمرا ریستوران کے کچن کے عین نیچے تھا اور وہ سنے ہوئے برتن یہاں لا کر ڈھیر کرتے تھے پھر وہ برتن یہیں دھوئے جاتے تھے اور اس کے بعد دوبارہ ریستوران میں پہنچائے جاتے تھے مگر بعد میں جب ریستوران میں ڈش واشنگ کی مشین نصب ہو گئی تو یہ کمرا ترک کر دیا گیا۔ اس کی افادیت ختم ہو گئی تھی۔

مگر وہ اب بھی بے کار نہیں تھا۔ وہ اسے استعمال کر سکتا تھا.... اور کرنے والا تھا!

جب وہ منصوبے پر غور کر رہا تھا تو اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ تاوان وصول ہونے تک کمال آفندی کے بیٹے کو کہاں رکھا جائے۔ اس وقت اسے اچانک یہ کمرا یاد آیا۔ وہ یہاں ریستوران کی ملازمت کے دوران میں برتن دھوتا رہا تھا.... لوگوں کے جوٹھے برتن.... ان لوگوں کے، جسے نہ اس سے کوئی غرض تھی، نہ اس کی کوئی پروا تھی۔ یہی زندگی ہے۔ کچھ لوگ خادم ہوتے ہیں اور کچھ مخدوم۔ مخدوموں کو خادم نظر بھی نہیں آتے۔

مگر اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسٹیشن پر اچھے، مہنگے کپڑے پہن کر آنے جانے والوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلا کر رہے گا۔ بدھ کا دن گزر جائے پھر وہ اسے کبھی نہیں بھولیں گے۔ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

اب آج رات وہ کمال آفندی کے بیٹے اور اس کی محبوبہ شیریں پاشا کو یہاں لے آئے گا.... ایران کے مصروف ترین ریلوے ٹرمینل میں۔ کسی کے چھپنے کے لئے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ کسی کا اس طرف دھیان بھی نہیں جائے گا۔ چلا بھی گیا تو اسے تلاش کرنا سراسر ناممکن ہے۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ بے رونق دیواروں کا اڑتا ہوا رنگ، کینوس کا پلنگ اور ٹائلٹ میں پانی کے ٹپ ٹپ گرنے کی آواز اسے ہیجان میں مبتلا کر رہی تھی۔

بدھ کے دن دوپہر کے ساڑھے گیارہ بجے.... اب سے ٹھیک 48 گھنٹے بعد وہ تبریز جانے والی فلائٹ پر ہو گا۔ تبریز، جہاں کوئی اسے نہیں جانتا اور وہاں اس کے پاس دولت ہو گی، وہ محفوظ ہو گا اور اگر شیریں اس سے محبت کرتی ہے تو وہ اسے بھی ساتھ

لے جائے گا۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کریں گے۔

اس نے احتیاط سے سوٹ کیس کو فرش پر رکھا اور اسے کھولا۔ اس میں سے منی کیسٹ ریکارڈر اور کیمرا نکال کر اس نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ شکاری چاقو اور ریوالور کوٹ کی داہنی جیب میں چلے گئے۔ کوٹ ایسا تھا کہ جیب کہیں سے بھی ابھری ہوئی نظر نہیں آ رہی تھی۔

پھر اس نے شاپنگ بیگ کھول کر اس کی چیزیں نکالیں اور انہیں ترتیب سے پلنگ پر رکھا۔ کوٹ، اسکارف، ٹیپ، بینڈیج اور ڈوری۔ انہیں اس نے اس بیگ میں رکھ لیا جو اس نے آرمی اسٹور سے کچھ دیر پہلے خریدا تھا پھر اس نے انلارج کرائی ہوئی تصویروں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتا رہا پھر مسکرا دیا۔

پہلی تین تصویروں کو تو اس نے پلنگ کے ساتھ والی دیوار پر اوپر لگا کر ٹیپ کی مدد سے چپکا دیا۔ چوتھی تصویر کو چند لمحے دیکھنے کے بعد اس نے واپس رکھ دیا۔ ابھی اسے ڈسپلے کرنا مناسب نہیں۔ یہ کام بعد میں کیا جائے گا۔

وقت گزرا جا رہا تھا۔ اس نے لائٹ آف کی اور دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر کی سن گن لی لیکن باہر قدموں کی کوئی چاپ نہیں تھی۔ وہ باہر نکلا اور دروازے کو بے آواز بند کرتے ہوئے لاک کر دیا۔ لوہے کے زینے سے اتر کر وہ سرنگ میں آیا۔ پھسلواں راستے سے چڑھ کر وہ زاہدان والے پلیٹ فارم پر پہنچا۔ ذرا دیر بعد وہ مسافروں میں گھل مل گیا۔

وہ بالائی لیول پر پہنچا تو سمنان کے لئے ٹرین روانہ ہونے والی تھی!

○

جلال کارنر پر کھڑا اسکول کی بس کے آنے کا منتظر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سائرہ آنٹی کھڑکی میں کھڑی اسے دیکھ رہی ہیں۔ اسے یہ بات بہت ناپسند تھی۔ اس کے دوستوں کی مائیں اپنے بیٹوں کو ایسے کبھی نہیں دیکھتی تھیں۔ وہ ایسا چھوٹا بچہ تو نہیں تھا کے جی کا، کہ اس پر یوں نظر رکھی جائے۔ وہ تو پہلی جماعت میں تھا۔

خرم چوتھی جماعت میں تھا۔ وہ بھی یہیں سے بس میں سوار ہوا۔ اس وقت خرم بس کی طرف دوڑ کر آتا دکھائی دیا۔ جلال جلدی سے سنگل سیٹ کی طرف بڑھا۔ اسی

لمحے پیچھے سے خرم نے کہا "جلال.... ادھر آؤ۔ یہاں دو کی سیٹ خالی ہے۔"

اب جلال کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

وہ بہ مشکل بیٹھے ہی تھے کہ خرم شروع ہو گیا "آج صبح امروز میں تمہارے بابا کو دیکھا۔"

"امروز؟" جلال کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"ٹی وی پر ایک پروگرام آتا ہے۔ اس کا نام ہے امروز۔"

"میرے بابا جانی اور ٹی وی پر۔ مذاق کر رہے ہو؟"

"سیریس.... میں نے خود دیکھا ہے۔ وہ خاتون بھی تھیں جنہیں میں نے تمہارے گھر دیکھا تھا.... وہ شیریں پاشا۔ تمہارے بابا اور وہ بحث کر رہے تھے۔ لڑ رہے تھے۔"

"کیوں؟" جلال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خرم کی بات پر یقین کرے یا نہ کرے۔

"اس لئے کہ شیریں پاشا کو برے آدمیوں کو مارنا اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے بابا کو اچھا لگتا ہے۔ میرے پاپا کہہ رہے تھے کہ تمہارے بابا ٹھیک کہتے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جس نے تمہاری ماما کو مارا ہے' اسے سزا ملنی چاہئے۔"

جلال کھڑکی کی طرف مڑ گیا۔ اس نے چہرہ کھڑکی کے شیشے سے لگا لیا۔ باہر پھر برف باری شروع ہو گئی تھی۔ سب کچھ گرے لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا.... کاش بابا رات کو گھر میں ہوتے ۔ اسے سائرہ آنٹی اور آفاق انکل کے ساتھ اکیلے رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ لوگ اچھے تھے۔ اس کا خیال رکھتے تھے مگر آپس میں لڑتے بہت تھے۔ آفاق انکل باہر جاتے تھے اور پی کر آتے تھے۔ اس پر سائرہ آنٹی کو غصہ آتا تھا۔ وہ اس کے سامنے غصہ چھپانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن چھپا نہیں پاتی تھیں۔

"تم خوش نہیں ہو کہ بدھ کو جواد اصغر کو پھانسی ہو جائے گی؟" خرم نے اس سے پوچھا۔

"میں.... میں.... مجھے کیا پتا۔ میں نے سوچا ہی نہیں۔" جلال نے دھیمی آواز میں کہا۔

حالانکہ یہ سچ نہیں تھا۔ جلال اکثر اس بارے میں سوچتا تھا۔ ایک تو وہ بار بار اس

رات کو خواب میں دیکھتا تھا۔ اس رات جو کچھ ہوا' وہ سب پلٹ پلٹ کر اس کے خواب میں آتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کھلونا ٹرین چلا رہا تھا۔ باہر اب اندھیرا ہونے لگا تھا۔ ماما دکان سے سودا لے کر آئی تھیں اور اسے کچن میں ترتیب سے رکھنے میں مصروف تھیں۔ اس کی ٹرین پٹڑی سے اتر گئی۔ اس نے جلدی سے سوئچ آف کر دیا۔

پھر اسے عجیب سی آواز سنائی دی.... چیخ جیسی.... لیکن چیخ بلند نہیں تھی.... وہ لپک کر نیچے گیا۔ ڈرائنگ روم میں اندھیرا تھا لیکن ماما اسے نظر آ رہی تھیں۔ وہ کسی کو پیچھے دھکیل رہی تھیں۔ ان کے منہ سے عجیب سی' گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ آدمی ماما کا گلا دبا رہا تھا۔

جلال لینڈنگ پر کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ ماما کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن ہلنا بھی اس کی بس میں نہیں تھا۔ وہ مدد کے لئے چیخنا چاہتا تھا لیکن آواز پر بھی اس کا بس نہیں تھا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے حلق سے ویسی ہی آوازیں نکل رہی ہیں جیسی ماما کے حلق سے نکل رہی تھیں۔ گھٹی گھٹی آوازیں پھر اس کے گھٹنے لرزنے لگے۔ اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ ڈھے گیا۔

یہ آواز سن کر آدمی نے سر گھما کر اسے دیکھا اور ماما کو چھوڑ دیا۔ ماما گر پڑیں۔ کچھ دیر کے لئے جلال کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کتنی دیر؟ اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

جلال کو لگا کہ ماما گری ہیں' وہ بھی گرا ہے۔ اسی وقت کمرا کچھ روشن لگنے لگا۔ ماما فرش پر پڑی تھیں۔ وہ آدمی ان پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ اب بھی ماما کے گلے پر تھے پھر اس نے جلال کو دیکھا اور اٹھ کر بھاگنے لگا۔ جلال نے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ وہ پسینے سے تر تھا اور اس پر خوف کا تاثر تھا۔

جلال کو یہ سب پولیس کو بتانا پڑا تھا پھر مقدمے کے دوران میں اس نے اس آدمی کو پہچانا۔ بابا جانی کہتے تھے' اب وہ سب کچھ بھول جاؤ۔ وہ کہتے تھے کہ ممی کے ساتھ گزرے ہوئے اچھے وقت کو یاد کرو لیکن وہ کبھی نہیں بھول سکا۔ وہ بار بار وہ سب کچھ خواب میں دیکھتا تھا اور آنکھ کھلتی تو وہ دمے کے دورے کے اثر میں ہوتا۔

اور اب بابا جانی' شیریں آنٹی سے شادی کرنے والے تھے اور آفاق انکل اور سائرہ آنٹی اصفہان جانے والے تھے۔ جلال سوچتا تھا کہ بابا جانی شادی کریں گے اور کیا اسے

ان کے ساتھ اصفہان بھیج دیں گے۔ کاش ایسا نہ ہو! وہ پریشان ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

شیریں' ایوننگ نیوز کے دفتر کے سامنے ٹیکسی سے اتری۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ بلڈنگ میں داخل ہوئی۔ وہ سیدھی نیوز روم میں گئی۔ یہ شام کا اخبار تھا۔ اس وقت اس روز کے ایڈیشن کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ ایک کارکن نے اسے دیکھتے ہی کہا کہ سٹی ایڈیٹر اس سے ملنا چاہتا ہے۔

وہ سٹی ایڈیٹر کے کمرے میں گئی۔ سٹی ایڈیٹر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا "آپ اپنا آج کا کالم لائی ہیں؟"" اس نے پوچھا۔

"ہاں....."

"اس میں گورنر سے رابطے کا تذکرہ ہے؟"

"بالکل ہے' دیکھیں نا.... ابھی ہمارے پاس 48 گھنٹے ہیں۔"

"بھول جایئے اس بات کو۔"

شیریں نے حیرت سے اسے دیکھا اور دیکھتی رہی "کیا مطلب ہے تمہارا؟ اس معاملے میں تم پوری طرح میرے ساتھ ہو۔"

"میں نے کہا نا' بھول جایئے یہ سب کچھ۔ کچھ دیر پہلے گورنر کے پریس سیکریٹری نے بڑے صاحب کو فون کیا تھا۔" سٹی ایڈیٹر کا اشارہ اخبار کے پبلشر کی طرف تھا' جسے بڑے صاحب کہا جاتا تھا۔ "سیکریٹری نے کہا کہ ہم اخبار کی اشاعت بڑھانے کی خاطر بلا وجہ سنسنی پھیلانے کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ گورنر صاحب کا کہنا ہے کہ وہ خود بھی سزائے موت کے خلاف ہیں لیکن جب تک کوئی نئی شہادت سامنے نہ آئے' انہیں جواد اصغر کی سزائے موت کو ٹالنے کا قانوناً کوئی حق نہیں لہٰذا بلا وجہ ان پر دباؤ ڈالنا بے سود ہے۔ بڑے صاحب نے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔"

شیریں کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ اس کے حلق میں گولا سا پھنس گیا۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

سٹی ایڈیٹر اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا "آپ ٹھیک تو ہیں خاتون.... دیکھیں.... آپ کچھ دن آرام کیوں نہیں کر لیتیں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" شیریں نے بہ مشکل کہا۔

"آپ اپنا کالم دے کر گھر چلی جائیں۔ مجھے افسوس ہے خاتون پاشا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ گورنر صاحب کی بات بھی درست ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ قانون کے تحفظ کے ساتھ قتل کرنے کے جرم پر اب احتجاج ممکن نہیں رہا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور کمرے سے نکل آئی۔

اپنی میز پر پہنچ کر اس نے اپنا بیگ کھولا اور کالم نکالا جس کے لئے اس نے تقریباً پچھلی پوری رات کھپائی تھی۔ اس نے اس کے پرزے پرزے کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا پھر اس نے پیڈ سامنے رکھا اور نیا کالم لکھنے بیٹھ گئی۔

"ہمارا معاشرہ اپنا وہ حق ایک بار پھر استعمال کرنے والا ہے جو اسے ایک ظالمانہ قانون نے دوبارہ عطا کر دیا ہے۔ جان لینے کا حق۔ میں ذاتی طور پر اسے عام قتل سے بھی بڑا جرم سمجھتی ہوں کہ معاشرہ ایک فرد کو سزا کے طور پر زندگی سے محروم کر دے اور اس کے ضمیر پر بوجھ تک نہ ہو۔ قارئین کرام' آپ کی کیا رائے ہے...."

وہ لکھتی رہی.... لکھتی گئی.... کالم مکمل کر کے اس نے اخبار کے سپرد کر دیا اور بلڈنگ سے نکل آئی۔ اس بار ٹیکسی والے کو اس نے اپنے گھر کا پتا دیا تھا۔

برف باری اب بھی ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا' اگر یہ جاری رہی تو کل بچے اسکیٹنگ کے لئے گھروں سے نکل آئیں گے۔ پچھلے ماہ وہ کمال کے ساتھ اسکیٹنگ کے لئے پارک گئی تھی۔ جلال کو بھی اس کے ساتھ چلنا تھا لیکن عین وقت پر جلال نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے چنانچہ وہ گھر میں ہی رہ گیا۔ شیریں کو احساس تھا کہ بچہ اسے پسند نہیں کرتا ہے۔

وہ اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچی۔ گھر چمک رہا تھا۔ صفائی کرنے والی شاید ابھی صفائی کر کی رخصت ہوئی تھی۔ ہر چیز چمک رہی تھی۔ پالش کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ گملوں کی صفائی کر دی گئی تھی۔ پودوں کو پانی دے دیا گیا تھا۔ گھر آ کر اسے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔

کمال کو اس کا گھر.... اور خاص طور پر اس کا کمرا بہت اچھا لگا تھا "تم بہت خوش ذوق بھی ہو اور سلیقہ مند بھی۔" اس نے کہا تھا۔

وہ بیڈ روم میں گئی' لباس تبدیل کیا اور سونے کے لئے لیٹ گئی۔ شام کو اسے سمنان جانا تھا۔ اس سے پہلے چند گھنٹے کی نیند وہ لے سکتی تھی۔

اس نے ساڑھے تین بجے کا الارم لگایا تھا لیکن سونا کوئی آسان کام نہیں تھا اور اس کی وجہ مایوسی تھی۔ اسے یقین تھا کہ گورنر جواد اصغر کی سزائے موت فی الحال ضرور روک دے گا۔ شیریں کو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ جواد اصغر مجرم ہے لیکن پندرہ سال کی عمر میں ایک چھوٹے سے داغ کے سوا اس کی زندگی صاف ستھری تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بہت کم عمر تھا۔

اسے کمال آفندی کا خیال آیا۔ کمال جیسے لوگ عوامی رائے کو سزائے موت کے حق میں منظم کر رہے تھے اور کمال کی شخصیت بہت متاثر کن تھی۔ اس کی ساکھ بہت اچھی تھی۔ اس کے قلم میں بہت اثر تھا۔ لوگ اس کی بات کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ صاحب الرائے اور روشن خیال تھا۔ وہ متعصب نہیں تھا۔ بظاہر اسے کوئی ضدی بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ کیا وہ کمال سے محبت کرتی ہے۔ اس کا جواب نہ دیر طلب تھا' نہ مشکل۔ ہاں.... ہاں....ہاں.... بہت زیادہ۔

اور کیا وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے؟ اس موضوع پر آج انہیں گفتگو کرنی ہے۔ کمال سر توڑ کوشش کر رہا تھا کہ جلال کے دل میں اس کے لئے قبولیت پیدا ہو جائے لیکن جلال کوئی آسان بچہ نہیں تھا۔ اس کے اندر استرداد بہت مستحکم تھا۔ اب یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے یا اس کا رویہ ہر اس عورت کے ساتھ یہی ہو گا جس کے بارے میں اسے ڈر ہو گا کہ وہ اس کے بابا جان پر قابض ہونے کی.... اسے اس سے چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔

کیا وہ سمنان میں رہ سکتی ہے؟ تہران اسے بہت پسند ہے لیکن کمال سمنان سے شفٹ ہونے پر کبھی راضی نہیں ہو گا۔

اور اس نے ابھی رائیٹر کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز ہی کیا تھا۔ اس کی کتاب

کا انیسواں ایڈیشن شائع ہونے والا ہے۔ تو کیا وہ روشن مستقبل.... اپنا کیریئر بھول کر شادی جیسی پابندی قبول کرلے گا۔

کمال! اس نے غیر شعوری طور پر اپنے چہرے کو چھوا۔ کمال کے ہاتھوں کا لمس اسے اب بھی اپنے چہرے پر دہکتا محسوس ہو رہا تھا اور ہاتھ کی پشت پر اس کے ہونٹوں کی حدت آفریں خوشبو اب بھی مہک رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں بہت زیادہ کشش محسوس کرتے تھے لیکن وہ اس کے ضدی پن کو ناپسند کرتی تھی۔ کمال میں اتنی لچک نہیں تھی کہ وہ کہیں سمجھوتا قبول کرلے۔ وہ کوئی رائے قائم کرلیتا ہے تو پھر اس پر ڈٹ جاتا ہے۔

بالآخر اسے نیند آگئی اور شاید فوراً ہی وہ خواب شروع ہوگیا۔ وہ ایک کالم لکھ رہی تھی.... بلکہ لکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا قلم کاغذ پر چل رہا تھا مگر کاغذ پر ایک حرف بھی نہیں لکھا جا رہا تھا۔ جیسے اس کے قلم میں روشنائی ہی نہ ہو۔ اس نے قلم کو چیک کیا۔ قلم میں روشنائی پوری حد تک بھری ہوئی تھی پھر اچانک کمال کمرے میں آگیا۔ وہ ایک نوجوان شخص کا بازو مروڑ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رسی تھی۔ جس کے ایک سرے پر پھندا بنا ہوا تھا۔ نوجوان شخص بار بار التجائی لہجے میں کہے جا رہا تھا "مجھے افسوس ہے۔ میں شرمندہ ہوں لیکن میں مجبور تھا۔ یہ ضروری تھا" مگر کمال نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور اب وہ اس کی گردن میں پھندا ڈال رہا تھا۔

اور شیریں جو آواز سن کر جاگی' وہ اس کی اپنی چیخوں کی آواز تھی "نہیں..... نہیں.... نہیں...." وہ جاگی تو اس وقت بھی وہ چلا رہی تھی۔

○

چھ بجنے میں پانچ منٹ پر لوگ جلد از جلد گھر پہنچنے کی جلدی کر رہے تھے۔ ایسی سرد رات میں وہی لوگ گھر سے دور رہتے ہیں جو کسی بھی وجہ سے ایسا چاہتے ہوں۔

وہ ایک ریسٹورنٹ کے سامنے واقع پارکنگ لاٹ کے قریب اس طرح کھڑا تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اچھا خاصا اندھیرا ہوگیا تھا اور وہ نسبتاً" زیادہ تاریکی میں تھا۔ وہ گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ برف کے ذرات اس کے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ اسے وہاں کھڑے بیس منٹ ہوئے تھے اور اسے اپنی ٹانگیں سردی سے سن ہوتی

محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔ اس کا پاؤں قدموں کے پاس رکھے بیگ سے ٹکرایا۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کو چھوا اور طمانیت بھرے انداز میں سرہلا دیا۔

اب آفاق اور سائرہ کسی بھی لمحے آتے ہوں گے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ پہلے ریسٹورنٹ میں کچھ کھائیں گے اور پھر ساڑھے سات والے شو میں "گون ود دی ونڈ" دیکھیں گے۔

اس کا جسم تن گیا۔ ایک کار پارکنگ لاٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ اس کار کو پہچانتا تھا۔ یہ وہی دونوں تھے۔ انہوں نے گاڑی ریسٹورنٹ کے دروازے کے سامنے والے حصے میں پارک کی۔ وہ انہیں کار سے اترتے دیکھتا رہا۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ اس کے بعد وہ احتیاطاً" دو منٹ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کے بعد حرکت میں آیا۔ اس نے قدموں میں رکھا ہوا بیگ اٹھایا' سڑک پار کی اور رائل سینما کی طرف چل دیا۔

رائل سینما میں شو چل رہا تھا۔ انٹرول کے بعد فلم شروع ہوئے بیس منٹ ہوئے ہوں گے۔ سوا سات بجے شو ختم ہونا تھا۔ سینما کے پارکنگ ایریا میں پچاس کے لگ بھگ کاریں موجود تھیں۔ اس نے دور ایک گوشے میں کھڑی ڈارک براؤن شیورلیٹ کار کا انتخاب کیا۔ دروازہ کھولنا اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے چابی اگنیشن میں ڈال کر گھمائی۔ انجن دھیمی آواز میں غرانے لگا۔ وہ مسکرایا اور گاڑی کو ڈرائیو کرتے ہوئے سڑک پر لے آیا۔

چار منٹ بعد وہ کار کو آفندی کے گھر کے ڈرائیو وے میں لے جا رہا تھا۔ وہاں ایک چھوٹی سرخ کار پہلے سے موجود تھی۔

○

شیریں کو تہران سے سمنان کی ڈرائیو میں ڈیڑھ گھنٹا لگا۔ فاصلہ اتنا نہیں تھا لیکن برف باری کی وجہ سے ڈرائیو کرنا آسان نہیں تھا۔ اسے بہت احتیاط سے کام لینا تھا اور وقت گزرنے کا اسے احساس بھی نہیں ہوا کیونکہ وہ سوچتی رہی تھی۔ وہ ایک طرح سے ریہرسل کر رہی تھی کہ کمال سے کیا کہے گی اور کیسے کہے گی۔ "یہ بات بنے گی نہیں

کمال۔ ہمارا سوچنے کا انداز ایک دوسرے کے برعکس ہے اور جلال بھی مجھے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ یہی بہتر ہے کہ اب ہم کبھی ایک دوسرے سے نہ ملیں۔ تم مجھے بھول جاؤ۔"

کمال کا مکان اسے ڈپریس کرتا تھا۔ پورچ میں روشنی بہت زیادہ ہوتی تھی اور باڑھ بہت اونچی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کمال اور نازنین اس مکان میں منتقل ہونے کے بعد بہ مشکل ڈیڑھ ماہ ساتھ رہے تھے پھر نازنین کا قتل ہو گیا تھا۔ انہوں نے مکان کی ڈیکوریشن کے بارے میں جو منصوبے بنائے تھے' ان پر عمل ہی نہیں ہو سکا تھا۔

گاڑی پارک کر کے وہ اندر پہنچی تو سائرہ کی گرم جوشی اور جلال کی سرد مہری نے اس کا خیر مقدم کیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اس نے سوچا۔ یہ بس آخری بار ہے۔ اس کے بعد یہ سب کچھ کبھی دہرایا نہیں جائے گا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس خیال نے اسے اور اداس کر دیا۔

سائرہ یقیناً بہت بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ "خاتون شیریں۔" اس نے اس کی گاڑی کی آواز سنتے ہی دروازہ کھول دیا۔ "بہت خوشی ہوئی کہ آپ آ گئیں۔" اس نے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا۔ وہ جانے کے لئے تیار تھی۔ لباس تبدیل کر چکی تھی۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی نظر آ رہا تھا۔

"آپ کیسی ہیں خاتون سائرہ؟" شیریں نے اندر داخل ہونے سے پہلے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ بس آپ کا انتظار تھا۔ آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔"

جلال قالین پر پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد کئی میگزین بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں قینچی تھی۔ بال اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ شیریں نے اپنی نوٹ بک اور بیگ ایک طرف رکھ دیا۔

"جلال بابا' آنٹی کو سلام کرو۔" سائرہ کے لہجے میں تحکم تھا۔

جلال نے سر اٹھایا اور بڑی بے دلی سے شیریں کو سلام کیا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی اور لہجہ دکھ سے بوجھل تھا۔ شیریں کا جی چاہا کہ اس کے پاس بیٹھے اور اسے لپٹا لے لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اسے جھٹک دے گا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسئلہ کیا ہے۔ بس بیٹھے بیٹھے رونا شروع کر دیا۔ کوئی وجہ بھی نہیں بتاتا۔" کہتے کہتے سائرہ نے دروازے کی طرف رخ کیا اور بلند آواز میں آفاق کو پکارنے لگی۔

شیریں کے کان جھنجھنا گئے۔ وہ جلدی سے جلال کے پاس جا بیٹھی۔ "تم کیا کر رہے ہو ننھے شہزادے؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے جانوروں کی تصویریں اپنی اسکریپ بک میں چپکا کر لے جانی ہیں۔" جلال نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

شیریں جانتی تھی کہ جلال شرمندہ ہے کہ اس نے روتے ہوئے دیکھا "سردی بہت ہے۔ میں اپنے لئے کافی بنا لوں پھر تمہاری مدد کر دوں گی۔ یہ بتاؤ' تمہیں کچھ دوں۔ کوک.... یا کچھ اور؟"

"جی نہیں۔" جلال نے ہچکچاتے ہوئے کہا پھر بولا "شکریہ۔"

"آپ آرام سے بیٹھیں۔ گھر سنبھالیں میں نے کھانا تیار کر دیا ہے۔ جو کچھ آقائے آفندی نے کہا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں جانے میں اتنی جلدی مچا رہی ہوں۔" سائرہ بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ آپ کا حق ہے۔ آج آپ کی شادی کی سالگرہ ہے۔ مبارک ہو۔" شیریں نے کہا۔

سائرہ نے پھر اپنے شوہر کو آواز دی۔ شیریں کے کان پھر جھنجھنا گئے۔

"میں آ رہا ہوں۔" آفاق کی جوابی پکار سنائی دی پھر وہ اوپری منزل سے نیچے آیا "میں تمام کھڑکیاں دروازے بند کر رہا تھا۔" اچانک اس کی نظر شیریں پر پڑی "شام بخیر خاتون شیریں۔ کیسی ہیں آپ؟ کب آئیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟"

آفاق پستہ قامت تھا۔ اس کی گردن بہت موٹی تھی۔ عمر ساٹھ سے کچھ اوپر تھی۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شراب کے معاملے میں وہ اعتدال سے کام نہیں لیتا۔ شیریں کو خیال آیا کہ کمال اس بات سے بھی فکر مند رہتا ہے۔

"اب چلو بھی۔" سائرہ نے آفاق سے کہا۔ اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔"

یہی تو ایک موقع ہوتا ہے میں تمہارے ساتھ کہیں باہر جاتی ہوں۔ اس میں بھی تم دیر لگاتے رہتے ہو۔ دل نہیں چاہتا نا....“

”چل رہا ہوں۔ چل رہا ہوں۔“ آفاق نے گہری سانس لے کر کہا۔

وہ جانے لگے تو شیریں ان کے ساتھ دروازے تک گئی ”خدا آپ کو یہ موقع مبارک کرے۔ خوب انجوائے کریں۔“ اس نے کہا۔

”شکریہ۔“ سائرہ نے کہا پھر پلٹ کر جلال کو پکارا ”جلال بابا.... آنٹی کو اپنا رپورٹ کارڈ دکھاؤ۔“ وہ پھر شیریں کی طرف مڑی۔ ”بہت ذہین بچہ ہے۔ پڑھائی میں بہت تیز.... دھیان بھی لگاتا ہے۔ شام کو میں نے اسے کچھ کھلانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں۔ کھاتا تو ہے ہی نہیں۔ اچھا ہم چلتے ہیں۔“

ان کے جانے کے بعد شیریں کچن میں گئی۔ اپنے لئے کافی بناتے وقت اسے خیال آیا۔ اگرچہ جلال نے منع کر دیا تھا مگر اس نے سوچا کہ وہ اس کے لئے کوکو بنا دے گی۔ اس نے دیگچی میں دودھ ڈال کر دوسرے چولھے پر رکھ دیا۔

کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ چولہا بہت گندہ ہو رہا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے رگڑ رگڑ کر صاف کیا جائے مگر چولھا کیا' پورے گھر کا یہی حال تھا۔ اس گھر کو سجایا.... سنوارا نہیں جا سکا تھا۔

وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ باہر بہت اچھا منظر تھا مگر باؤنڈری وال کے اندر لگے ہوئے بے حد اونچے درخت اس کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ اس نے سوچا' میں ان درختوں کو کٹوا دوں گی۔ ایک اچھا خوب صورت روح پرور منظر انسان کو سچی خوشی عطا کرتا ہے۔ پریشانی' دکھ اور ملال مٹا دیتا ہے۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ چونکی۔ میں ایسا کیوں کروں گی؟ کیا حق ہے مجھے اس کا؟ اس نے خود کو ڈانٹا۔ اپنے کام سے کام رکھو شیریں پاشا۔

تو یہ مکان.... میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے اس کی بہتری کی خاطر تبدیلیاں لانے کا کوئی حق نہیں اور اب.... آج کے بعد میں کمال سے کبھی نہیں ملوں گی۔ وہ تنہائی کے احساس سے لبالب بھر گئی۔ تو جب آپ کو کسی محبوب ہستی سے دست بردار ہونا پڑے تو ایسے تکلیف ہوتی ہے۔ اسے خاتون مہ وش کا خیال آ گیا۔ وہ جواد اصغر کی

ماں تھی۔ بیوہ تھیں۔ دنیا میں ایک بیٹے کے سوا ان کا کوئی نہیں تھا اور اس بیٹے کو اب پھانسی ہونے والی تھی۔ ان پر کیا گزر رہی ہو گی۔ پرسوں ان کا بیٹا ہمیشہ کے لئے ان سے بچھڑ جائے گا۔

خاتون مہ وش کا فون نمبر اس کے پاس تھا۔ جب اس نے جواد اصغر کے کیس میں دلچسپی لینی شروع کی تھی تو ان کا انٹرویو بھی لیا تھا۔ بے چاری خاتون۔ جب وہ انٹرویو کے لئے ان سے ملنے گئی تھی وہ کیسی پرامید تھیں اور جب انہیں پتا چلا کہ وہ جواد اصغر کو بے قصور نہیں سمجھتی تو وہ کتنی اپ سیٹ ہوئی تھیں لیکن دنیا کی کوئی ماں اپنے قاتل بیٹے کو قاتل نہیں سمجھ سکتی۔ یہ تو قدرتی بات ہے۔

اس نے سوچا' اس وقت اس عورت کو اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔ کوئی بات کرنے والا ہی میسر آ جائے تو وہ دل کا بوجھ تو کم از کم ہلکا کر سکتی ہے اور پھر بات کرنے والا بھی وہ ہو جس نے اس کے بیٹے کی جاں بخشی کے لئے سر توڑ کوشش کی ہو تو یقیناً اسے خوشی ہو گی۔

شیریں نے دودھ کی دیگچی والے چولھے کی آنچ ہلکی کی اور کمرے میں آ کر خاتون مہ وش کا نمبر ملایا۔ ایک گھنٹی بجی تھی کہ خاتون نے کال ریسیو کر لی۔

”خاتون مہ وش.... میں شیریں پاشا بول رہی ہوں۔“ شیریں نے ماؤتھ پیس میں کہا ”میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنا دکھ' کتنا افسوس ہے۔ کاش میں آپ کے لئے کچھ کر سکتی پھر بھی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کریں۔“

”تم پہلے ہی میرے لئے بہت کچھ کر چکی ہو.... بہت کچھ۔“ خاتون کے لہجے میں تلخی تھی ”اگر بدھ کے روز میرے بیٹے کو پھانسی دی گئی تو تم اس کی ذمے دار ہو گی.... صرف تم۔“

شیریں سناٹے میں آ گئی ”خاتون.... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

”تم نے اپنے ہر کالم میں یہی لکھا کہ اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ میرا بیٹا قاتل ہے۔ تم نے ہمیشہ یہی لکھا کہ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ جواد قاتل ہے' اصل مسئلہ یہ ہے کہ جواد بے قصور ہے۔ یہی لکھا نا تم نے مگر سن لو کہ اصل مسئلہ یہی تھا۔“ اب خاتون مہ وش غصے سے لرزتی آواز میں چیخ رہی تھیں ”مسئلہ ہے ہی یہی۔

بہت لوگ جانتے ہیں کہ میرا بچہ تو کسی کو تکلیف پہنچانے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا۔ جان لینا تو دور کی بات ہے۔ ایسے لوگ گورنر سے اس کے لئے رحم کی درخواست کر رہے تھے لیکن تم نے گورنر کو مجبور کر دیا کہ وہ رحم کی اپیل پر غور کرنے کے بجائے میرے بیٹے کے کیس کو میرٹ پر رکھے۔ کل اگر میرے بیٹے کو پھانسی ہو گئی تو میں تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کروں گی' اس کی ذمے دار میں نہیں ہوں گی۔"

اور اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ شیریں ہاتھ میں موجود ریسیور کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ خاتون مہ وش کا رد عمل بے حد تند ہی نہیں' اس کے لئے بے حد اچانک اور غیر متوقع تھا۔ اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

کچھ لمحے بعد وہ سنبھل کر دوبارہ کچن میں گئی۔ دودھ ابلنے والا تھا۔ اس نے مگ میں کوکو کا پاؤڈر ڈالا اور اسے تھوڑے سے دودھ میں چمچے سے گھولنے لگی پھر اس نے مگ کو دودھ سے بھر کر چمچی سے ہلایا اور مگ کو ٹرے پر رکھ کر ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔

اسی وقت اطلاعی گھنٹی بجی!

جلال اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا' کیا پتا' یہ بابا جانی ہوں۔"

شیریں نے دروازے کے ڈبل لاک کے ہٹنے کی آواز سنی۔ نجانے کیوں اسے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ "جلال' پہلے پوچھ لو کہ کون ہے۔" اس نے جلال کو پکارا "تمہارے بابا کو گھنٹی بجانے کی ضرورت نہیں۔ چابی ان کے پاس رہتی ہے۔" اس نے جلدی سے ٹرے میز پر رکھ دی۔

اس کی بات جلال کی سمجھ میں آ گئی "کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آقائے آفاق موجود ہیں۔ انہوں نے جنریٹر منگوایا تھا۔ میں وہ لے کر آیا ہوں۔" باہر سے کسی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" جلال نے پلٹ کر شیریں سے کہا "بابا جانی نے آفاق انکل سے جنریٹر کے لئے کہا تھا۔"

جلال دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ دروازے کو باہر سے پوری قوت سے دھکیلا گیا۔ جلال اچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ ششدر شیریں نے ایک شخص کو بجلی کی سی تیزی سے

اندر آتے اور پھر دروازے کو اندر سے بند کرتے دیکھا۔ فرش پر پڑا ہوا جلال اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ شیریں لپک کر اس کے پاس گئی اور سہارا دے کر اسے کھڑا کیا پھر اسے لپٹائے لپٹائے وہ بن بلائے مہمان کی طرف مڑی۔

اسے بیک وقت دو چیزوں کا احساس ہوا۔ ایک اس شخص کی سرد' گھورتی ہوئی نگاہیں اور دوسرے اس کے ہاتھ میں موجود لمبی نال کا ریوالور "تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے بے حد دھیمی آواز میں پوچھا۔ جلال کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے اسے اور زور سے لپٹا لیا۔

"تم شیریں پاشا ہو؟"

شیریں کو اپنا دل حلق میں دھڑکتا محسوس ہوا۔ جلال کی سانسوں کی آواز اب سیٹی سے مشابہ ہو گئی تھی۔ شاید خوف کی وجہ سے اس پر دمے کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اب ایسے میں اس ریوالور بردار شخص سے تعاون کرنا ضروری تھا "دیکھو.... میرے پرس میں چار سو تومان ہوں گے۔ وہ تم...."

"شٹ اپ!"

وہ ایسا سرد لہجہ تھا کہ شیریں کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ اجنبی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا بیگ نیچے رکھ دیا۔ وہ ایسا بیگ تھا' جس کی گہرائی زیادہ نہیں تھی مگر وہ افقی سمت میں بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ بیگ کھول کر اس نے اس میں سے موٹی ڈوری کا اسپول اور چوڑی بینڈیج کا ایک رول نکالا "یہ لو۔ بچے کے ہاتھ پاؤں باندھو.... اور آنکھوں پر بینڈیج چپکا دو۔" اس نے شیریں کو حکم دیا۔

"نہیں.... یہ میں نہیں کروں گی۔"

"بہتری اسی میں ہے۔"

شیریں نے جلال کو دیکھا۔ وہ اس اجنبی شخص کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں مگر ان میں دھندلاہٹ تھی۔ شیریں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بچے کی کس طرح مدد کرے۔ کیا صورت نکالے....

"لڑکے.... بیٹھ جاؤ۔" اجنبی نے جلال سے کہا۔

جلال نے امداد طلب نظروں سے شیریں کو دیکھا پھر خاموشی سے زینے کی نچلی

سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

شیریں بھی اس کے پاس بیٹھ گئی "جلال' ڈرو نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں نا۔" اس نے بینڈیج کھولی اور اسے جلال کی آنکھوں پر لپیٹنے لگی۔

اجنبی جلال کو گھورے جا رہا تھا "اب اس کے ہاتھ پاؤں باندھو شیریں۔" اس بار اس کے لہجے میں بڑی اپنائیت تھی.... اور اس نے پیار بھرے لہجے میں اس کا نام لیا تھا۔

ڈوری سے جلال کے ہاتھ باندھتے ہوئے شیریں نے بندشیں اتنی ڈھیلی چھوڑیں کہ دوران خون متاثر نہ ہو۔

اجنبی نے جیب سے چاقو نکال کر ڈوری کو کاٹ دیا "جلدی کرو۔ پاؤں بھی باندھو۔"

شیریں نے خاموشی سے تعمیل کی۔ بچہ خوف سے لرز رہا تھا۔ اس نے اس کے ٹخنوں پر ڈوری لپیٹی اور گرہ لگا دی۔

"اس کے منہ کو ٹیپ سے بند کر دو۔"

"اس کی سانس رک جائے گی۔ یہ دمے کا مریض ہے...." لیکن الفاظ شیریں کے لبوں پر دم توڑ گئے۔ اجنبی کا چہرہ دیکھتے ہی دیکھتے تبدیل ہو گیا تھا۔ اسے خوف آنے لگا۔ اسے ڈر تھا کہ اجنبی بھڑک کر کچھ کر نہ بیٹھے۔ اس نے اس حکم کی بھی تعمیل کر دی۔

پھر اچانک اجنبی نے اسے دھکیلا۔ وہ آگے کی طرف گری۔ اجنبی کے گھٹنے اس کی کمر میں چبھ رہے تھے۔ اجنبی نے اس کے دونوں ہاتھ کھینچ کر پیچھے کی طرف کئے اور بڑی پھرتی سے ڈوری کی مدد سے اس کے ہاتھ باندھ دیئے۔ اس نے احتجاج کے لئے منہ کھولا۔ مگر اسی لمحے اجنبی نے اس کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونس دیا۔ اس کے بعد اس کے منہ پر پٹی لپیٹ کر پیچھے کی طرف اس میں گرہ لگا دی۔

شیریں کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ادھر اجنبی کے ہاتھ اس کی ٹانگوں پر متحرک تھے پھر وہ بالائی حصے پر ٹھہر گئے۔ اس کے بعد وہ پھر نیچے کی طرف متحرک ہوئے اس بار اجنبی نے اس کی ٹانگیں باندھیں اور اسے کسی گڑیا کی طرح اٹھا لیا۔

شیریں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

پھر دروازہ کھولا گیا۔ سرد اور نم ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ شیریں کو احساس ہوا کہ اجنبی نے باہر کی روشنیاں گل کر دی ہیں۔ ایک لمحے بعد اس کا کندھا کسی سرد دھاتی چیز سے ٹکرایا پھر دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ کار ہے۔ اگلے ہی لمحے اس نے خود کو گرتا محسوس کیا۔ اس کی ٹانگیں کار کے فرش سے ٹکرائیں۔ جھٹکا اس کے ٹخنوں تک محدود رہا۔

وہ کار کے عقبی حصے میں پھینکی گئی تھی۔

پھر اسے جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اجنبی شاید دوبارہ گھر میں جا رہا تھا۔ وہ ڈر گئی۔ کہیں وہ جلال کو....؟ اس سے آگے اس سے سوچا نہیں گیا۔ اس کی کلائیوں سے بازوؤں تک درد کی لہر دوڑ رہی تھی۔ اسے اجنبی کی نظریں یاد آئیں۔ وہ جلال کو عجیب انداز میں دیکھ رہا تھا۔

لمحے گزرتے رہے۔ وہ دل میں دعا کرتی رہی 'اے خدا.... معصوم بچے کی حفاظت کرنا' آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ چاپ قریب آئی۔ کار کا اگلا دروازہ کھولا گیا۔ وہ شاید کینوس کا بیگ لا رہا تھا۔ اف خدایا.... جلال اس بیگ میں ہو گا۔ وہ لرز کر رہ گئی۔

اس نے بیگ کو جھٹکے سے سیٹ کے آگے کار کے فرش پر پٹخ دیا۔ خاصی زور دار آواز سنائی دی تھی۔ بے چارہ بچہ۔ چند لمحے بعد ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی پھر دروازہ بند ہوا۔ اب وہ جھک کر اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے شیریں کے اوپر ایک پرانا بدنما کوٹ ڈال دیا۔ شیریں کسمسائی۔ کوٹ سے پسینے کی بہت خراب بو آ رہی تھی۔ پرانے پن کی بو الگ تھی۔

پھر کار کا انجن جاگا اور کار حرکت میں آ گئی۔

شیریں سمتوں کا دھیان رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بعد میں پولیس یقیناً یہ جاننا چاہے گی۔ کار بائیں جانب مڑی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ شیریں سردی سے کانپ رہی تھی۔ ہاتھوں پر ڈوری کی بندش اور سخت ہوتی جا رہی تھی۔ یہ لرزنے کی وجہ سے تھا۔ اس نے کوشش کی کہ اپنے جسم پر قابو رکھے لیکن سردی محسوس کرنے پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

پرسکون رہو۔ پریشان ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا' اس نے خود سے کہا۔
اگر برف باری ہو رہی ہے تو نشانات کچھ دیر یقیناً رہیں گے۔ ڈھونڈنے والوں کو سراغ مل سکتا ہے لیکن نہیں.... برف کے ساتھ ہوا بھی چل رہی تھی۔ نشانات ذرا دیر میں ہی دفن ہو جائیں گے۔

اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ وہ ناک سے ہموار انداز میں سانس لینے کی کوشش کرنے لگی پھر اسے جلال کا خیال آ گیا۔ وہ تو کینوس کے بیگ میں بند ہے.... اور دمے کا مریض بھی ہے۔ اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ وہ پریشان ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اب کار کی رفتار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ڈھلوانی سفر گواہی دے رہا تھا کہ وہ تہران جا رہے ہیں۔

○

خالد یزدانی اپنے ڈرائنگ روم کی کھڑکی میں کھڑا برف باری کا منظر دیکھ رہا تھا۔
برف باری شدت پکڑ گئی تھی۔ وہ بے حد سرد رات تھی۔ اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس وقت اپنے گھر میں ہے۔ عجیب بات تھی۔ پورے دن ایک نامعلوم پریشانی کے احساس نے اسے جکڑے رکھا تھا۔ نسرین کی طبیعت پچھلے چند ہفتوں سے ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ حالانکہ وہ اسے چھیڑتا رہتا تھا کہ ہر گزرنے والا دن اسے اور حسین بنا رہا ہے لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ نسرین کے تمام بال تیزی سے سفید ہوئے تھے۔

آج صبح وہ کافی لے کر نسرین کے پاس گیا تو اسے یہ دیکھ کر پریشانی ہوئی کہ نسرین کی رنگت زرد ہو رہی ہے اور اس کا چہرہ کچھ زیادہ ہی استخوانی لگ رہا تھا۔ اپنے دفتر سے اس نے ڈاکٹر کو فون کیا "ڈاکٹر' میرا خیال ہے' بدھ کو ہونے والی سزائے موت بھی اس پر اثر انداز ہو رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"میں آپ سے متفق ہوں آقائے یزدانی۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "دیکھیں نا' اس لڑکے کو سزا دلوانے میں کلیدی کردار خاتون یزدانی کی گواہی کا ہے۔"

یہ سوچتے ہوئے خالد یزدانی نے سر جھٹکا۔ گواہی کے فوراً بعد ہی نسرین پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ یزدانی ڈرتا تھا۔ اسے بار بار خیال آتا تھا کہ دل کا اگلا دورہ خدانخواستہ

مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔
نسرین کی عمر 58 سال تھی۔ اب جبکہ بچے بڑے ہو کر علیحدہ ہو چکے تھے اور خود مختاری کی زندگی گزار رہے تھے تو خالد یزدانی کے پاس بیوی کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا اور اب ان کے پاس مہلت تھی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ' ایک دوسرے کے لئے جی سکیں۔ خالد یزدانی اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ایسا ہوا تو وہ جیتے جی مر جائے گا۔

یہ بات خوش کن تھی کہ نسرین گھر کی دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی کے لئے ملازمہ رکھنے پر راضی ہو گئی تھی۔ کل صبح سے عائشہ کام پر آنے لگی تھی۔ وہ نو بجے سے ایک بجے تک یہاں رہے گی۔ نسرین کو ذرا آرام کا موقع بھی مل سکے گا۔

نسرین کمرے میں آئی اور اسے جام تھما دیا "شکریہ ڈیئر۔" خالد یزدانی نے کہا پھر اسے احساس ہوا کہ نسرین خود کوک پی رہی ہے اور اگر اس سردی میں وہ برانڈی نہیں لے رہی ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے۔

نسرین بھی اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئی تھی۔ خالد نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا "آج تمہارے سینے میں درد ہے؟"

"ایسے ہی معمولی سا۔"

"آج تم نے کتنی نائٹرولیں....؟"

"تین چار۔ تم پریشان مت ہو۔" نسرین نے کہا پھر چونک کر بولی "ارے..... آفندی کے گھر کو دیکھو۔ باہر کی روشنیاں بجھی ہوئی ہیں۔"

"اوہ.... اسی لئے مجھے باہر زیادہ اندھیرا لگ رہا تھا۔" خالد نے کہا "لیکن جب میں آیا تھا تو وہاں روشنی تھی۔"

"تمہارا خیال ہے۔ ٹھیک طرح سے دھیان نہیں دیا ہو گا تم نے۔"

"جی نہیں۔ میں یقین سے کہہ رہا ہوں یہ بات۔"

"تو پھر لائٹ آف کیوں کرے گا کوئی۔" نسرین کے لہجے میں ہلکی سی پریشانی تھی "تم ذرا ٹہلتے ہوئے جاؤ اور چیک کر لو۔"

"اب یہ ایسی غیر معمولی بات تو نہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ میرا خیال ہے' پچھلی باتوں نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔"

ارے.... دیکھو تو خالد۔ آفندی کے ڈرائیو وے سے ایک گاڑی نکلی ہے۔ ہیڈ لائٹس بھی روشن نہیں ہیں۔"

"تم پریشان نہ ہو۔ بیٹھ جاؤ۔" خالد نے زور دے کر کہا "میں کچھ پنیر لاتا ہوں۔"

نسرین نے اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا چشمہ نکالا۔ چشمہ لگا کر اس نے سڑک اور آفندی کے مکان کی طرف دیکھا۔ مکان پر سکوت طاری تھا۔ جبکہ وہاں سے برآمد ہونے والی گاڑی اب تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

○

روزنامہ طلوع کے کانفرنس روم میں ہونے والی میٹنگ سوا سات بجے تک جاری رہی۔ موضوع گفتگو تازہ ترین سروے رپورٹ تھی۔ اس سروے میں ان لوگوں سے بات کی گئی تھی، جن کی عمر پچیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ ان میں 67 فی صد لوگوں نے روزنامہ طلوع کو دو حریف روزناموں "خبر" اور "وقت" پر ترجیح دی تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ اس سے پہلے ان دونوں روزناموں کو طلوع سے بڑا سمجھا جاتا تھا۔ یہی نہیں، طلوع کی اشاعت میں بھی پندرہ فی صد اضافہ ہوا تھا۔

اخبار کے پبلشر نعمان شاپور نے کہا تھا "یہ سب کچھ ہمارے لئے باعث فخر ہے۔ آج کے دور میں اخبار یا کوئی میگزین شائع کرنا کوئی معمولی کام نہیں اور میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہماری اس کامیابی میں کمال آفندی کی تخلیقی صلاحیتوں نے سب سے اہم کردار ادا کیا ہے، جن سے ہم پچھلے تین سال سے استفادہ کر رہے ہیں۔"

بعد میں لفٹ میں شاپور کے ساتھ نیچے آتے ہوئے کمال نے کہا "میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ یہ آپ کی فراخ دلی تھی کہ آپ نے مجھے سراہا۔"

بوڑھے شاپور نے کندھے جھٹک دیئے "میں سچی بات کہنے سے کبھی نہیں چوکتا آفندی۔ اب صحیح معنوں میں ہماری آمدنی بڑھے گی۔ مجھے احساس ہے کہ تمہیں اب تک کچھ نہیں دیا جا سکا، جس کے تم مستحق ہو اور تم نے کوئی آسان وقت بھی نہیں گزارا ہے۔"

کمال اداسی سے مسکرایا "میرے لئے یہ بہت سخت وقت تھا۔"

اسی لمحے لفٹ رکی، اس کا دروازہ کھلا۔ وہ دونوں لابی میں آئے "شب بخیر آقائے

شاپور۔" کمال نے کہا "میں اب چلتا ہوں۔ مجھے ساڑھے سات والی ٹرین...."

"میں اپنی کار میں تمہیں اسٹیشن ڈراپ کر دوں گا۔" شاپور نے پیشکش کی۔

کمال کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

ڈرائیو کے دوران میں شاپور نے کہا "تم بہت تھکے تھکے لگ رہے ہو۔ میرا خیال ہے، کچھ جواد اصغر کی پھانسی کا معاملہ بھی تم پر اثر انداز ہو رہا ہے۔"

کمال نے کندھے جھٹک دیئے "قدرتی بات ہے۔ ہر اخبار نازنین کی موت کی تفصیلات شائع کر رہا ہے۔ مجھے جلال کی فکر ہے۔ اسکول میں نجانے کیا کیا سنتا ہو گا وہ اور پھر مجھے جواد اصغر کی ماں سے بھی ہمدردی ہے۔ سچ یہ ہے کہ مجھے جواد اصغر کا بھی دکھ ہے۔"

"تم اپنے بچے کو کچھ دنوں کے لئے کہیں دور کیوں نہیں لے جاتے؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ واقعی بہتر ہو گا ہمارے لئے۔"

نعمان شاپور نے گاڑی اسٹیشن کے سامنے روکی "یہ لو.... ایشیا کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن آ گیا مگر اب یہاں پہلے جیسا رش نہیں ہوتا۔ پہلے تو ہر روز بلاشبہ لاکھوں افراد یہاں سے کہیں جاتے یا کہیں سے یہاں آتے تھے۔ میں نے ایک اخبار میں لکھا تھا۔ سینٹرل اسٹیشن، لاکھ انسانی زندگیوں کی کراس لائن مگر اب وہ بات نہیں۔"

"پہلے یہ ٹرانسپورٹ کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اب لوگوں کے پاس کاریں بہت ہیں پھر بھی اس کی افادیت ختم نہیں ہوئی۔"

"ٹھیک کہتے ہیں۔ اب زمانہ ترقی کر گیا ہے۔"

"آقائے شاپور، لفٹ کا شکریہ۔" کمال نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔

کمال تیز قدموں سے چلتا ٹرمینل میں داخل ہوا۔ ٹرین کی روانگی میں ابھی سات منٹ تھے۔ اس نے سوچا، گھر فون کر کے شیریں کو بتا دے کہ وہ ساڑھے سات والی ٹرین سے آ رہا ہے۔ وہ ایک قریبی فون بوتھ میں گیا اور گھر کا نمبر ملایا۔

گھنٹی بجتی رہی، دوسری طرف سے کسی نے ریسیو نہیں کیا۔ کمال نے رابطہ منقطع کر کے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار بھی کال ریسیو نہیں کی گئی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ کہاں ہیں یہ دونوں؟ کیا کر رہے ہیں؟ کہیں جلال کو دورہ تو نہیں پڑ گیا دمے کا.... اور شیریں اسے

اسپتال لے گئی ہو۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ٹرین کی روانگی میں صرف ایک منٹ تھا - وہ اسپتال فون کر کے ڈاکٹر شہریار سے جلال کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن فون کرنے کی صورت میں اس کی ٹرین مس ہو جاتی۔ اس نے فوری فیصلہ کیا اور ریسیور کو ہک پر لٹکا کر پلیٹ فارم کی طرف لپکا۔ اس نے اس وقت بوگی میں قدم رکھا' جب ٹرین حرکت میں آ چکی تھی۔

ایک لمحے بعد ایک مرد اور عورت اس فون بوتھ کے پاس سے گزرے' جو کمال آفندی نے ابھی خالی کیا تھا۔ عورت گرے کلر کا ایک لمبا کوٹ پہنے تھی۔ اس کے سر کو اور بالوں کو ایک بڑے اسکارف نے ڈھانپ رکھا تھا۔ مرد اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے کینوس کا ایک بیگ اٹھا رکھا تھا' جس کی افقی لمبائی غیر معمولی تھی۔ وہ بیگ ایسا تھا' جیسے کرکٹ کے کھلاڑیوں کے کٹ بیگ ہوتے ہیں۔

○

فلم ختم ہو گئی تھی لیکن عائشہ کا اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ فلم تھی ہی ایسی اثر انگیز۔ بالآخر وہ ہچکچاتے ہوئے اپنی سیٹ سے اٹھی۔ اب ایسی فلمیں کیوں نہیں بنتیں۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہال سے نکلنے لگی۔ اگلے دو منٹ میں فلم کا سحر ٹوٹ گیا۔ وہ زمین پر آ گئی۔ زندگی کی تلخ حقیقتیں جو وہ کچھ دیر پہلے بھول گئی تھی' پھر ذہن میں ابھر آئیں۔ بچوں کے کپڑے چھوٹے ہو گئے تھے۔ سبھی کو نئے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ شکر ہے کہ خرم نے اسے ملازمت کی اجازت دے دی تھی۔ کل سے وہ کام پر جانا شروع کر دے گی۔ یزدانی فیملی اسے اچھی لگی تھی۔ کام بھی زیادہ نہیں تھا۔ تنخواہ بھی معقول تھی۔ وہ بچوں کو اسکول چھوڑے گی اور کام پر چلی جائے گی۔ کھانا پکا کر رکھ جائے گی مگر وہ کچھ نروس تھی۔ بارہ سال بعد وہ دوبارہ ملازمت کرنے والی تھی۔

باہر آتے ہی اسے سردی کا ڈنک لگا۔ پارکنگ لاٹ سینما کے پیچھے تھا۔ اسے گھوم کر جانا تھا۔ اس سردی میں یہ تھوڑا سا فاصلہ اسے اپنے اوپر ظلم لگا۔ یہ بات طمانیت بخش تھی کہ خرم نے کھٹارا کار کی مرمت کرا دی تھی ورنہ پرانی کار بہت تنگ کرتی ہے۔ مرمت پر رقم تو لگی تھی مگر نئی ملازمت کے لحاظ سے وہ اچھی سرمایہ کاری تھی۔

وہ جلدی سے پارکنگ لاٹ میں پہنچی۔ خرم نے کہا تھا کہ وہ کھانے پر اس کا انتظار کرے گا۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اسے خود بھی بھوک لگ رہی تھی.... اور وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ خرم اس کی خاطر بھوکا بیٹھا رہے۔ وہ کتنی محبت کرتا تھا اس سے۔ اس نے کہا تھا "تم جاؤ اور انجوائے کرو۔ میں بچوں کا خیال رکھوں گا۔ ہر پریشانی کو بھلا دو۔"

پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر وہ پریشان ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ اس نے کار یہیں پارک کی تھی لیکن کار اب وہاں نہیں تھی۔ اسے یاد تھا کہ کار سے اتر کر اس نے دیکھا تھا تو سامنے بینک کی کھڑکی اسے نظر آ رہی تھی۔ وہ اسے اب بھی نظر آ رہی تھی لیکن

کار موجود نہیں تھی۔

دس منٹ بعد وہ پولیس اسٹیشن سے خرم کو فون کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے سسکتے ہوئے خرم کو کار چوری ہونے کی اطلاع دی۔

○

وہ برف باری کے دوران میں ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے ٹائم ٹیبل پر غور کر رہا تھا۔ اب اس عورت کو اپنی کار کی گمشدگی کا پتا چلے گا اور وہ سیدھی پولیس کے پاس پہنچے گی۔ جس وقت تک پولیس گاڑی کی تلاش شروع کرے گی' وہ ان سے دور ہو چکا ہو گا۔

اب شیریں پاشا اس کے قبضے میں تھی۔ اس کے متعلق سوچتے ہی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اسے اس کے جسم کی گرمی یاد آئی' جب وہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رہا تھا اور جب وہ اسے اٹھا کر کار کی طرف لے جا رہا تھا تو وہ خوف زدگی کی اداکاری کر رہی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ اس بہانے جان بوجھ کر وہ اپنا چہرہ اس کے ہاتھ سے رگڑتی رہی تھی۔

وہ شیڈول سے پیچھے ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سڑک پر ٹریفک بہت تھا۔ گاڑیاں تقریباً رینگ رہی تھیں۔ سڑک پر پھسلن بہت زیادہ تھی۔ ایسے میں لوگ خطرے سے بچنے کے لئے گاڑی آہستہ چلاتے ہیں۔ اسے ان تمام لوگوں پر غصہ آ رہا تھا' جو بزدلی دکھا رہے تھے۔ وہ جھنجلا رہا تھا۔ اس نے حساب لگایا تھا کہ سوا سات بجے تک وہ سینٹرل اسٹیشن پہنچ جائے گا۔ یہ وہ وقت تھا' جب اسٹیشن پر زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت لوگوں کی نظر میں آنے کا امکان بہت کم تھا۔

سر توڑ کوشش کے نتیجے میں وہ سات بج کر اٹھارہ منٹ پر اپنے پہلے اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ اس نے کار روکی' ہیڈ لائٹس بجھائیں اور نیچے اترا۔ اس نے عقبی دروازہ کھول کر وہ کوٹ اٹھایا' جو اس نے شیریں کے اوپر ڈال دیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ شیریں اسے دہکتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ دھیرے سے ہنسا۔ جیب سے کیمرا نکال کر اس نے اس کی تصویر لے لی۔ فلیش چمکی تو شیریں پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔ اس نے شیریں کو کندھوں سے تھاما اور پیٹ کے بل لٹا دیا۔ جیب سے چاقو نکال کر اس نے اس

کے ہاتھ اور پیروں کی بندشیں کاٹ ڈالیں۔

"اب میں تمہارے منہ سے کپڑا نکال رہا ہوں شیریں۔" اس نے کہا "لیکن تمہارے منہ سے کوئی ہلکی سی آواز بھی نکلی تو بچہ ختم ہو جائے گا۔ سمجھ گئیں؟"

اس نے شیریں کی آنکھوں کی پٹی بھی کھول دی "پلیز.... میری بات سنو۔" شیریں کے لہجے میں التجا تھی "دیکھو.... جلال کا دم گھٹ جائے گا۔"

"اب یہ سب تم پر ہے۔" اس نے شیریں کو کار سے اتارا۔ وہ کھڑی ہوئی۔ برف کے ذرات اس کے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ اسے چکر بھی آ رہے تھے۔ ہاتھوں اور پیروں میں' جہاں اسے باندھا گیا تھا' سوزش بھی ہو رہی تھی۔

"یہ کوٹ پہن لو۔" اس نے شیریں کی طرف لمبا کوٹ بڑھایا۔ شیریں نے بے دلی سے کوٹ کو چھوا۔ یہ وہی بدبودار کوٹ تھا' جو اس نے اس کے اوپر ڈالا تھا۔ اجنبی نے کوٹ پہننے میں اسے مدد دی۔

"سر پر یہ اسکارف باندھ لو۔"

شیریں نے بدمزگی سے اسکارف کو دیکھا۔ وہ بہت بڑا تھا۔ دیکھنے میں بہت گندہ اور پرانا لگ رہا تھا۔ بہرحال وہ اونی تھا اور گرم تھا۔ شیریں نے اسے اپنے سر پر لپیٹا اور جیسے تیسے ٹھوڑی کے نیچے اس میں گرہ لگا دی۔

"اب کار میں بیٹھ جاؤ۔ تم جتنی جلدی کرو گی' بچے کے لئے اتنا ہی بہتر ہو گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ اس کا دم گھٹ ہی جائے۔" یہ کہتے ہوئے اجنبی نے اسے اگلی سیٹ پر دھکیلا پھر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے انجن اسٹارٹ کر دیا۔

خالی بیگ کار کے فرش پر رکھا تھا۔ شیریں نے جھک کر اسے ٹٹولا اور جلال کے سر کو سہلایا "فکر نہ کرو جلال۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔" اس نے دلاسا دیا لیکن اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے وہ بے حس و حرکت محسوس ہوا تھا۔ 'اے خدا.... اس بچے کو کچھ نہ ہونے دینا۔' اس نے دل میں دعا کی۔

کار اب سینٹرل اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ شیریں کو پہلی بار گرد و پیش کا اندازہ ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ پرامید ہو گئی مگر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اجنبی کے ہر حکم کی تعمیل کرے گی۔

گاڑی سگنل پر رکی۔ اگلے ہی لمحے پولیس کی ایک گشتی کار ان کی کار کے برابر آ کر رکی۔ ڈرائیو کرنے والے پولیس نے سر گھما کر شیریں کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں چند لمحوں کے لئے ملیں۔ شیریں براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ کاش..... اسے کسی گڑبڑ..... کا احساس ہو جائے۔ اچانک اسے اپنے پہلو میں کوئی چیز چبھتی محسوس ہوئی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ اجنبی کے ہاتھ میں چاقو تھا "اب اگر پولیس ہمارے پیچھے آئی تو پہلے میں تمہاری تواضع اس چاقو سے کروں گا اور اس کے بعد بچے کی باری آئے گی۔" اجنبی نے سرد لہجے میں کہا۔

اس کے لہجے نے شیریں کو ٹھٹھرا دیا۔

سگنل کھلا۔ گاڑی آگے بڑھی۔ گشتی پولیس کی کار ان کے عین پیچھے تھی۔ اس کا سائرن چیخ رہا تھا اور چھت پر لگی سرخ روشنی گھوم رہی تھی۔ شیریں دل میں دعا کرتی رہی۔ وہ بہت خطرناک لمحے تھے۔ پھر پولیس کار کی رفتار بڑھی اور وہ ان کی کار کو اوورٹیک کر گئی۔ چند لمحے بعد وہ موڑ مڑ کر اوجھل ہو گئی۔

شیریں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس سڑک پر سینٹرل ریلوے اسٹیشن کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ سڑک اسٹیشن پر پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ اجنبی ڈرائیو کرتا رہا۔ بالاخر اس نے ارم ہوٹل سے کچھ دور سینٹرل اسٹیشن کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی "اب ہم ٹرمینل ہی جائیں گے۔" اس نے دھیمی آواز میں شیریں سے کہا "تم میرے ساتھ ساتھ چلو گی۔ کوئی حماقت نہ کرنا۔ میرے ہاتھ میں یہ بچے والا بیگ ہو گا۔ ہماری طرف کوئی بھی متوجہ ہوا..... تو چاقو بچے کے گلے میں پیوست ہو جائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا گلا کس طرف ہے۔" اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور رخسار میں ایک نس پھڑکنے لگی تھی "سمجھ گئیں؟"

شیریں نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا جلال یہ سب کچھ سن رہا ہو گا؟

اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔ اسٹیشن کے سامنے کی یہ سڑک اس وقت سنسان تھی۔ شیریں نے سوچا 'شاید اب یہ ہمیں کسی ٹرین پر لے جائے گا اور تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ہم کہیں کے کہیں پہنچ چکے ہوں گے'۔

اچانک شیریں کو اپنے دائیں ہاتھ میں چبھن کا احساس ہوا۔ وہ حجر القمر کی وہ انگوٹھی تھی' جو کمال نے عید پر اسے تحفے میں دی تھی۔ ہاتھ بندھے تو جہاں انگوٹھی میں ابھار تھا' وہ اس کے ہاتھ میں چبھتا رہا تھا۔ بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ شیریں نے بڑی احتیاط سے انگوٹھی اتاری اور اسے سیٹ کے پیچھے گرا دیا۔

اسی لمحے اجنبی نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کار سے اتری۔ مگر اجنبی نے فوراً اسے دوبارہ کار میں دھکیل دیا۔ اب وہ دوبارہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رہا تھا۔ شیریں دل میں دعا کر رہی تھی کہ انگوٹھی پر اس کی نظر نہ پڑے اور اس کی دعا قبول ہو گئی۔

اجنبی نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ٹیپ چپکانے کے بعد اسے نیچے اتارا' پھر اس نے وہ بیگ اٹھا لیا جس میں جلال بند تھا۔ پتا نہیں' بچہ زندہ بھی ہو گا یا اس کا دم گھٹ گیا ہو گا۔ شیریں پریشان ہو گئی۔

"چلو میرے ساتھ۔" اجنبی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے سڑک کی طرف کھینچا۔ چند لمحے بعد وہ سڑک پار کر رہے تھے۔ اب ایک مرد اور ایک عورت عام سا مفلسانہ لباس پہنے ٹرمینل میں نظر آئیں گے' جن کے ہاتھ میں سوٹ کیس کے بجائے بیگ ہو گا۔ کون ان پر توجہ دے گا؟ کوئی نہیں۔

ٹرمینل میں داخل ہونے کے بعد وہ مین پلیٹ فارم کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہاں کوڈک کا بہت بڑا اشتہاری بورڈ نظر آ رہا تھا۔ اس کی سرخی تھی.... "حسن کو جہاں بھی پاؤ' ہمیشہ کے لئے قید کر لو"..... کیسی سچی بات تھی۔ اجنبی یہی کر رہا تھا۔ شیریں کی نظر کلاک پر پڑی۔ سات بج کر انتیس منٹ۔ اسے کمال کا خیال آ گیا۔ وہ اس وقت ساڑھے سات والی ٹرین پکڑ رہا ہو گا۔ اس کا جی چاہا کہ چلا کر اسے پکارتی رہے 'کمال.... کمال.... ہمیں بچاؤ۔ کمال....'

فولادی انگلیاں اس کے بازو کو بھینچ رہی تھیں "چلو.... اس طرف آؤ۔"

اجنبی اسے نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ کیا کر سکتی ہے۔ 'سیڑھیوں سے پھسل کر گرے۔ یوں سب اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے لیکن نہیں.... وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ وہ ایک لمحے میں جلال کو ختم کر دے گا۔'

وہ نچلے لیول پر پہنچے۔ دائیں طرف روشن ریستوران کا داخلی دروازہ تھا۔ ابھی چند روز پہلے اس نے کمال کے ساتھ یہاں بیٹھ کر کافی پی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کمال کو پکارنے لگی۔ ’کمال.... آؤ ہمیں چھڑا لو۔ کمال پلیز....‘

اب وہ اسے بائیں جانب دھکیل رہا تھا ”ہمیں نیچے جانا ہے۔ ٹریک نمبر 112 پر۔“

شیریں کو سائن بورڈ سے پتا چلا کہ وہاں سے زاہدان کی گاڑی جاتی ہے۔ وہاں وقت بھی لکھا تھا۔ زاہدان جانے والی ٹرین آٹھ بج کر دس منٹ پر روانہ ہونے والی تھی۔

گیٹ کے قریب شیریں کو ایک غریب بوڑھی عورت نظر آئی۔ وہ بوسیدہ مردانہ جیکٹ پہنے تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھا۔ بوڑھی عورت کی نظراس پر پڑی تو وہ اسے گھورنے لگی۔ شیریں کے دل میں امید مچلی۔ ’شاید عورت کو کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا ہے۔‘

”چلتی رہو۔“ اجنبی نے سرگوشی میں کہا۔

وہ نیچے پہنچ گئے تھے۔ ٹریک نمبر 112 کا پلیٹ فارم بالکل سنسان تھا۔ اوپر کے مقابلے میں یہاں سردی کا احساس زیادہ تھا۔

”اس طرف آؤ۔“

اجنبی اب اسے زیادہ تیز چلا رہا تھا۔ پلیٹ فارم کے اختتام پر پہنچ کر وہ گھوم گئے۔ اب وہ پھسلواں راستے پر چل رہے تھے۔ کہیں سے پانی کی ٹپ ٹپ کی آواز آ رہی تھی پھر شیریں کو ایک پمپ چلنے کی آواز بھی سنائی دی۔ اب وہ ٹرمینل کی گہرائی میں تھے۔ شیریں پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس اجنبی کا کیا ارادہ ہے۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے ان کے ساتھ؟

پھسلواں راستے کا اختتام ایک ”نسبتاً“ کشادہ جگہ پر ہوا۔ وہ فٹ بال کے آدھے میدان جتنی جگہ تھی۔ بائیں جانب، کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر ایک تنگ آہنی زینہ تھا، جس کے ساتھ ریلنگ بھی تھی۔

”ادھر چلو۔ جلدی کرو۔“ اجنبی اسے زینے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ اب اس کی سانسیں پرشور ہو گئی تھیں۔

شیریں زینے پر چڑھنے لگی۔ اوپر اسے ایک لینڈنگ اور پھر وہی ایک آہنی دروازہ

نظر آیا۔

”بس رک جاؤ۔“

اجنبی نے جلال والا بیگ نیچے رکھ دیا۔ شیریں کو مدھم روشنی میں اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکتے نظر آئے۔ اس نے تالے میں چابی لگا کر گھمائی پھر دھکیل کر دروازہ کھولا اور شیریں کو اندر کی طرف دھکا دیا پھر وہ بیگ اٹھا کر خود بھی اندر آیا اور دروازے کو بند کر دیا۔ اس نے سوئچ دبا کر روشنی کی۔ دودھیا روشنی بہت مدھم اور ناکافی تھی لیکن اس سے پہلے کہ اندھیرے کو دھیان میں رکھ کر اسے بڑی نعمت قرار دیا جا سکتا تھا۔

شیریں نے اس گندے کمرے کا جائزہ لیا۔ زنگ آلود سنک کو دیکھا پھر اس کی نظر فرش پر پڑی۔ ان میں ایک بوسیدہ کوٹ تھا اور ایک سوٹ کیس تھا۔

”یہ تم ہمیں کہاں لے آئے؟ اور تم ہم سے چاہتے کیا ہو؟“ شیریں کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

اجنبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے وہ پلنگ کی طرف بڑھا۔ اس نے بیگ کو پلنگ پر رکھ دیا۔ شیریں گھٹنوں کے بل بیٹھی اور بیگ پر جھک گئی۔ اس نے تیزی سے بیگ کو کھولا اور جلال کے مڑے تڑے جسم کو چھوا پھر وہ دیوانہ وار جلال کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالنے لگی۔

بچہ سانس لینے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑی تھیں۔ شیریں نے سہارا دے کر اس کے سر کو اٹھایا، اپنے بازو پر رکھا اور آنکھوں پر بندھی پٹی کھولنے لگی۔

”اسے رہنے دو۔“ اجنبی نے سخت لہجے میں کہا۔

”پلیز.... دیکھ نہیں رہے کہ اس پر دمے کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ اسے مدد کی ضرورت ہے۔“ شیریں چلائی پھر اس نے نظریں اٹھائیں۔ اس کے حلق سے بہت خوف ناک چیخ نکلتی۔ اسے روکنے کے لئے اسے اپنے ہونٹ چبانے پڑ گئے۔

دیوار پر ٹیپ کی مدد سے تین بڑی تصویریں چپکائی گئی تھیں۔

ایک جوان عورت تھی، جو دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلائے بھاگ رہی تھی۔

بھاگتے ہوئے وہ پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر دہشت کا تاثر تھا۔

ایک اور جوان عورت ایک کار کے پاس پڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں پیچھے کر کے باندھ دی گئی تھیں۔

تیسری سیاہ بالوں والی ایک لڑکی کی تصویر تھی، جس کی عمر زیادہ سے زیادہ اٹھارہ انیس سال ہو گی۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے گلے پر تھا۔ چہرے اور آنکھوں سے الجھن کا تاثر جھانک رہا تھا۔

○

سرخاب برسوں پہلے اسکول میں پڑھاتی تھی پھر وہ ریٹائر ہو گئی۔ دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں تھا.... نہ گھر بار نہ کوئی رشتے دار۔ وہ اکیلی تھی اور اس نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ ملنے والی تمام رقم لے کر تہران چلی آئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اب وہ کیا کرے گی لیکن یہ جانتی تھی کہ اسے گھر کی ضرورت نہیں۔

اس رات جس لمحے وہ ٹرین سے اتری، سینٹرل ریلوے اسٹیشن پر وہ پہلا لمحہ ہی اس کی زندگی کا رخ موڑ دینے والا تھا۔ وہ حیران و پریشان تھی۔ اسٹیشن پر انسانوں کے بہت بڑے ہجوم میں ایک وہی تھی، جو تنہا تھی۔ اس نے اپنے سوٹ کیس کرائے کے ایک لاکر میں رکھے اور لیڈیز روم میں چلی گئی۔

اپنا حلیہ درست کر کے وہ باہر آئی تو اگلے چھ گھنٹے وہ اسٹیشن میں پھرتی پھری۔ اسے وہاں لوگوں کا ازدحام بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بھوک لگی تو اس نے ایک برگر لے کر کھایا پھر وہ دکانوں کا جائزہ لیتی رہی۔ تصور میں وہ ان دکانوں سے قیمتی چیزیں خریدتی رہی تھی۔ اس بات پر اسے ہنسی آ گئی.... اور وہ بلند آواز میں ہنسی تھی۔ اردگرد کے لوگوں نے چونک کر اسے دیکھا مگر اگلے ہی لمحے یوں دوسری طرف متوجہ ہو گئے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ بات اسے اور اچھی لگی۔ حسین آباد میں جہاں وہ اسکول میں پڑھاتی تھی، وہ ایک سرد آہ بھی بھرتی تو شہر کے تمام لوگوں تک یہ خبر پہنچ جاتی تھی۔ مگر اب وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کسی کو پروا نہ ہوتی۔ اسے آزادی کا دل خوش کن احساس جگمگا گیا۔

گھوم پھر کر وہ دوبارہ مین ویٹنگ روم میں لوٹ آئی۔

ریلوے اسٹیشن بھی بڑے متلون مزاج ہوتے ہیں۔ ابھی ایسا ہجوم ہے کہ چلنا بھی دشوار ہے اور ابھی ہجوم چھٹ جائے گا اور سب کچھ سنسان لگنے لگے گا اور اس کے تھوڑی دیر بعد پھر وہی ہنگامہ، وہی ہجوم۔ وہ وہیں بیٹھی یہ تماشا دیکھتی رہی۔

آدھی رات ہو گئی۔ اس نے افراد کے ایک ایسے گروپ کو دیکھ لیا، جو اس دوران میں کہیں نہیں گیا تھا۔ وہ وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان میں چھ مرد تھے اور ایک دبلی پتلی عورت۔ مگر لگتا تھا کہ اسے اپنے عورت ہونے کا احساس ہی نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں میں مردوں کی طرح گھل مل کر بات کر رہی تھی۔

پھر اس عورت کو دیکھے جانے کا احساس ہوا۔ اس نے سرخاب کو دیکھا اور اس کی طرف چلی آئی "تم یہاں نئی ہو خاتون؟" اس کا لہجہ بے حد نرم اور مہربان تھا۔

"ہاں۔"

"کوئی گھر، کوئی ٹھکانا نہیں؟"

"نہیں۔" سرخاب نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"خیر کوئی پرواہ مت کرو۔ ہم یہیں کے ہیں۔ تمہیں سب کچھ دکھا دیں گے۔" اس نے سرخاب کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنے گروپ کی طرف لے گئی۔

"تم یہیں قریب ہی رہتی ہو؟" سرخاب نے اس سے پوچھا۔

عورت کی آنکھیں مسکرائیں، ہونٹ کھلے اور زرد دانت دکھائی دیئے "نہیں خاتون۔ ہم لوگ یہیں رہتے ہیں۔ یہی میرا گھر ہے۔ ہمارا گھر۔" اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"تو، آپ لوگ یہیں رہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں شاہین ہوں۔"

اپنی باسٹھ سالہ زندگی میں سرخاب کو کبھی دوستی میسر نہیں آئی تھی لیکن شاہین کی باتوں سے اسے دوستی کی خوشبو آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے تو کبھی کسی نے اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ کلاس کے بچوں نے بھی نہیں۔ آخری عمر میں یہ تجربہ تو خوش کن ہی ہے۔

شاہین نے اسے سوچ میں دیکھا تو جلدی سے بولی "تم فکر مت کرو۔ اب تمہارا

کوئی مسئلہ تمہارا نہیں، ہم سب کا ہے اور ہم ہر مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔"

سرخاب خوش ہو گئی۔ گویا وہ ایسی ہے کہ کوئی اس کی پرواہ کر سکتا ہے اور اسے دلاسا بھی دے سکتا ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا "شکریہ۔"

یوں وہ اس گروپ میں شامل کر لی گئی۔ اس نے اپنے سوٹ کیسوں سے پیچھا چھڑایا اور شاہین کی طرح اپنا سامان شاپنگ بیگ میں رکھنے لگی۔ وہ ان لوگوں کی طرح پھیری والوں سے کھانے کی چیزیں لے کر پیٹ بھرتی۔ نہانے کے لئے اسٹیشن کے ٹوائلٹ موجود تھے۔ اور کہیں بھی پڑ کر سو رہتی۔

پھر اسے اسٹیشن میں ہی اپنا ایک ذاتی کمرا میسر آ گیا!

یہ کمرا سرخاب کا وہ راز تھا، جسے اس نے شاہین سے بھی چھپایا تھا۔ وہ پورا دن اسٹیشن کی سیاحت میں مصروف رہتی تھی۔ چنانچہ اسٹیشن کے چپے چپے سے واقف ہو گئی تھی۔ وہ تو سرنگوں میں بھی پھرتی رہتی تھی۔ ایسے میں ٹرین آتی تو اسے سرنگ کی دیوار سے چپکنا پڑتا۔ پاؤں پھسلنے کا مطلب یقینی موت تھا لیکن اسے کب پرواہ تھی۔ وہ تو اپنی بے مقصد زندگی گزار چکی تھی۔ پہلی بار اسے سنسنی خیزی ملی تھی۔ آزادی ملی تھی۔... اور وہ بہت خوش تھی۔

سب سے زیادہ اسے ٹرمینل کی گہرائی متاثر کرتی تھی۔ اس حصے کو ٹرمینل کے سیکیورٹی گارڈز جیل کہتے تھے۔ اس حصے کی اپنی مشینی آوازیں تھیں۔ وہاں بے شمار پمپ اور جنریٹر اور آلودہ ہوا کھینچنے والی مشینیں نصب تھیں، جو ہر وقت چلتی رہتی تھیں۔ ٹرمینل کو اگر جسم سمجھ لیا جائے تو یہ حصہ اس کا دل تھا، جو ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا۔

اس حصے میں جو آہنی زینہ تھا، اس کی لینڈنگ پر وہ بند دروازہ اسے ایک اسرار کی طرح لگا۔ کچھ اس لئے بھی کہ اس پر کچھ لکھا نہیں تھا۔ اس نے بہت محتاط انداز میں اس کے بارے میں ایک گارڈ سے پوچھا، جس سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ گارڈ نے اسے بتایا کہ وہ کمرا کسی زمانے میں روشن ریستوران کے برتن دھونے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔

"مجھے دکھاؤ نا۔" اس نے گارڈ سے کہا۔

"تمہارا اس سے کیا واسطہ؟" گارڈ نے اسے گھورا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس تجسس ہے مجھے۔ ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔"

گارڈ منع کرتا رہا مگر آخر میں اس کے اصرار سے مجبور ہو کر اسے وہ کمرا دکھانے لے گیا۔

وہ کمرا دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہاں کی سیلن کی بو، بے رونق دیواریں اور نیم تاریکی۔ اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے تو اس بات کی خوشی تھی کہ وہاں بجلی بھی ہے اور پانی بھی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے سمجھ لیا کہ یہ کمرا اس کی آخری خواہش بھی پوری کر دے گا.... جب ضرورت محسوس ہو، مکمل تنہائی اور پرائیویسی کی خواہش!

"یہاں باتھ بھی ہے۔" اس نے خوش ہو کر گارڈ سے کہا "میں یہاں سو لیا کروں؟"

"نہیں اماں۔ کسی کو پتا چل گیا تو میری نوکری ہی ختم ہو جائے گی۔"

"کسی کو پتا کیسے چلے گا۔ میں محتاط رہوں گی۔"

خاصی بحث کے بعد اس نے گارڈ کو اس پر بھی قائل کر لیا۔ یوں کبھی کبھی وہ وہاں رات گزارنے لگی پھر ایک دن اس نے گارڈ سے چابی لی اور چپکے سے ڈپلی کیٹ چابی بنوا لی۔ اب وہ گارڈ سے چھپ کر بھی وہاں جا سکتی تھی اور جب وہ گارڈ ملازمت سے ریٹائر ہوا تو وہ کمرا پوری طرح اس کا ہو گیا۔

تھوڑی تھوڑی کر کے وہ ضروری چیزیں وہاں پہنچاتی رہی۔ کینوس کا ایک پلنگ، نارنگیوں کا ایک خالی کریٹ۔ وہ آرام کرنے کے لئے باقاعدگی سے وہاں جانے لگی۔ وہاں کی تاریکی میں سونے سے اسے بڑا سکون ملتا تھا۔ سینے کے اوپر سے ٹرینیں گزرتی رہتی تھیں مگر اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔

موسم سرما میں وہ اس کمرے میں کبھی نہیں جاتی تھی۔ وہاں سیلن بہت تھی اور ٹھنڈ بھی بہت ہوتی تھی لیکن مئی سے ستمبر تک وہ ہفتے میں دو بار وہاں رات ضرور گزارتی تھی۔ ہر رات اس لئے نہیں کہ پولیس والے مشکوک نہ ہو جائیں اور اسے پکڑ نہ لیں۔ زندگی نے اسے سکھایا تھا کہ ہوس اچھی نہیں ہوتی۔ خواہش صبر کے ساتھ.... اور کم کم پوری کرنی چاہئے۔ یوں آدمی محرومی سے بچا رہتا ہے پھر یہ بھی تھا

کہ وہ بے گھروں کی اس ٹولی سے الگ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس کے لئے اب فیملی کی طرح تھے۔ وہ ہر رات غائب ہوتی تو شاہین کو تجسس ہوتا.... اور وہ پوچھتی تو وہ اس سے جھوٹ نہ بول پاتی۔

اس طرح چھ برس گزر گئے۔ وہ سرخاب کی زندگی کا سب سے اچھا عرصہ تھا۔ طمانیت اور خوشی سے بھرپور۔ گارڈ' اخبار والے' پھیری والے اور بیشتر دکان دار اسے پہچاننے لگے تھے۔ وہ بھی انہیں پہچاننے لگی تھی بلکہ وہ تو باقاعدگی سے سفر کرنے والوں کو بھی پہچاننے لگی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کون کس ٹرین سے کہاں جاتا اور کس ٹرین سے آتا ہے۔ اور کب۔

پیر کی اس شام سرخاب کے دل میں اپنے کمرے کو ایک نظر دیکھنے کی امنگ جاگی۔ خواہش اتنی شدید تھی کہ اس کے لئے صبر کرنا ناممکن ہو گیا۔ وہ وہاں جانے کے لئے بے تاب ہو گئی۔ اسے اپنے کمرے میں گئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ اس نے سوچا' دیکھا تو جائے۔ ممکن ہے' وہ اتنا سرد نہ ہو۔ کیا پتا' وہ رات کو وہاں سکون سے سو بھی سکے۔

وہ ٹرمینل کے نچلے لیول میں چلی گئی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ اس کی توجہ کا مرکز پولیس والا تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ کمرے کا رخ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے کمرے کی طرف جاتے دیکھے۔

موقع پا کر وہ ٹریک نمبر 112 کی طرف چل ہی رہی تھی کہ اس کی نظر گرے کلر کے اس پرانے لیڈیز کوٹ پر پڑی۔ اسے وہ پہچانتی تھی۔ اس نے اسٹیشن کے باہر ارم ہوٹل کے قریب' پرانے کپڑوں کی ایک دکان میں یہ کوٹ پہن کر دیکھا تھا۔ اسے وہ اچھا لگا تھا۔ لیکن خرید نہیں سکی تھی کیونکہ دکان دار قیمت کم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کوٹ کی لائننگ ایسی تھی کہ اس جیسا دوسرا کوٹ کہیں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اس وقت اس کوٹ نے اس کے تجسس کو جگا دیا۔ اس نے کوٹ کی لائننگ سے نظریں اٹھائیں اور پہننے والی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ وہ بے حد خوب صورت اور جوان لڑکی تھی۔ اس نے چہرے پر ایک بہت بڑا اسکارف لپیٹ رکھا تھا۔ اسکارف نے اس کے ہونٹ بھی چھپائے ہوئے تھے۔

اس لڑکی کے ساتھ جو شخص تھا' اسے وہ پچھلے کچھ دنوں سے اسٹیشن پر دیکھ رہی

تھی۔ مگر وہ لڑکی.... اتنی خوبصورت اور جوان.... اور وہ ایسی لگتی بھی نہیں تھی کہ ایسا کوٹ پہننے پر مجبور ہو۔

پھر سرخاب کی نظر لڑکی کے سینڈلوں پر پڑی۔ وہ نیچی ایڑی کے بے حد آرام دہ' خوب صورت اور یقینی طور پر مہنگے سینڈل تھے۔ سرخاب کو عجیب سا لگا۔ اتنے مہنگے سینڈلوں اور سیکنڈ ہینڈ کوٹ اور اسکارف کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ یہ تو عجیب بات تھی۔

لڑکی کا ساتھی مرد جو بیگ اٹھائے ہوئے تھا' وہ بہت بھاری لگ رہا تھا۔ اس میں یقیناً کوئی بڑی اور ٹھوس چیز تھی۔

سرخاب نے ان دونوں کو ٹریک نمبر 112 کی طرف جاتے دیکھا تو اس کا منہ بن گیا۔ اس ٹریک میں آدھے گھنٹے تک تو کسی ٹرین کی روانگی نہیں تھی پھر یہ ادھر کیوں جا رہے ہیں؟ وقت گزاری تو اوپر بھی کی جا سکتی ہے۔ جبکہ پلیٹ فارم پر سردی بہت ہے۔

پھر اس نے کندھے جھٹک دیئے۔ بات کچھ بھی ہو۔ یہ طے ہے کہ اس وقت وہ اپنے کمرے کی طرف نہیں جا سکتی کیونکہ پلیٹ فارم پر وہ دونوں موجود ہوں گے.... اور اسے اس طرف جاتے ہوئے دیکھ لیں گے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کل سہی۔ یہ سوچ کر وہ پلٹ گئی۔

○

فرید صادق نے ٹیپ ریکارڈر کا ریکارڈ کا بٹن دبایا اور بولا۔ "جواد.... بولو.... بولنا شروع کرو.... پلیز۔"

"نہیں۔" جواد اصغر اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹیپ ریکارڈر ان کے اور فرید کے درمیان تھا۔ وہ اٹھ کر تنگ کوٹھری میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا "کیا فائدہ ہے اس کا؟" اس کے لہجے میں مایوسی تھی اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے "آقائے صادق' آپ نے اپنی پوری کوشش کر لی۔" اس نے اپنی نم آنکھوں کو انگلی کی بالائی پور سے صاف کیا "لیکن اب تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ ممکن ہی نہیں۔"

فرید صادق اٹھا اور اس نے انیس سالہ جواد اصغر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "میں چاہتا ہوں' کوئی ایسی بات' کوئی ایسا جواز مل جائے کہ میں گورنر کو کم از کم سزائے موت

پر عمل درآمد ملتوی کرنے پر قائل کرلوں۔" اس نے جھک کر ریکارڈر کا بٹن آف کر دیا۔

"آپ نے اس سلسلے میں بھی ہر ممکن کوشش کرلی ہے اور وہ خاتون شیریں، انہوں نے تو ملک بھر کے بڑے لوگوں سے دستخط کرا کے گورنر کو رحم کی درخواست بھجوائی تھی۔ اس سے زیادہ کوئی کیا کرسکتا ہے۔ وہ بھی کچھ نہ کر سکیں...."

"لعنت بھیجو شیریں پاشا پر۔" فرید کی مٹھیاں بھنچ گئیں "اس نے تمہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ ہماری درخواست بہت موثر تھی۔ ایسے لوگ موجود تھے، جو جانتے ہیں کہ تم چیونٹی کو بھی نہیں مار سکتے۔ قتل کی اہلیت ہی نہیں ہے تم میں لیکن وہ منحوس پورے ملک میں چیختی پھری کہ تم مجرم ہو.... قاتل ہو.... لیکن تمہیں سزائے موت نہیں ہونی چاہئے۔ وہ تمہارے لئے نہیں لڑ رہی تھی، وہ سزائے موت کے خلاف لڑ رہی تھی۔ اس نے گورنر سمیت سب کو یقین دلا دیا کہ تم مجرم ہو.... قاتل ہو۔"

"تو اب آپ کیوں کوشش کرتے ہیں۔ اب سب کچھ لاحاصل ہے اور اب میں کچھ کہنا بھی نہیں چاہتا۔"

"تمہیں بولنا ہے۔" فرید صادق نے نرم لہجے میں کہا۔ اب وہ جواد کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ نوجوان جواد کی آنکھوں میں اسے سچائی نظر آتی تھی۔ وہ کالج جا کر تعلیم مکمل کرنا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی اسے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جا رہی تھی۔ یہ کیسی ستم ظریفی تھی۔ وہ تندرست و توانا نوجوان تھا۔ جیل میں گزرے ہوئے دو سال بھی اس کے کسرتی جسم کو پلپلا نہیں کرسکے تھے۔ وہ زندگی سے بھرپور تھا۔ جیل کی کوٹھری میں بھی وہ باقاعدگی سے ایکسرسائز کرتا رہا تھا "سنو لڑکے.... تم نے نازنین آفندی کو قتل نہیں کیا۔" فرید صادق نے چند لمحوں کے وقفے کے بعد کہا "اگر مجھے کوئی ایک ثبوت مل جائے۔ ایک ایسی معقول وجہ جس کے زور پر میں گورنر سے اسٹے آرڈر لے سکوں تو بات بن سکتی ہے اور ہمارے پاس صرف بیالیس گھنٹے کی مہلت ہے بیٹے۔"

"آپ خود ہی کہہ چکے ہیں آقائے صادق کہ گورنر صاحب مجھ پر رحم نہیں کریں گے۔"

فرید صادق جھنجلا گیا "دیکھو.... جب تم پر نازنین آفندی کا قتل ثابت ہوا تو بہت

سے لوگوں کا خیال تھا کہ اس سے پہلے جو دو عورتوں کو قتل کیا گیا تھا، جن کا مجرم ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا، وہ دونوں قتل بھی تم نے کئے تھے۔ وہ جو لڑکی تھی رخسار جلالی، وہ اسکول کے زمانے میں تمہاری ساتھی تھی اور وہ افشاں مجیدی، ان کے گھر کے سامنے سے تم نے برف ہٹائی تھی اور تمہاری گرفتاری کے بعد عرصے تک کوئی قتل نہیں ہوا۔ ایسے میں سب یہی سمجھ سکتے تھے مگر اب.... پچھلے مہینے پھر دو عورتیں قتل کر دی گئیں۔ اب ہم کسی طرح یہ ثابت کر دیں کہ نازنین کا قتل، پچھلے دو قتل اور حالیہ دونوں قتل.... یہ سب ایک ہی شخص نے کئے ہیں۔ تو تم بے قصور ثابت ہوتے ہو۔ میں بس یہ چاہتا ہوں جواد اور میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ دہرانا تمہارے لئے بے حد تکلیف دہ ہے لیکن تم ہمیشہ کہتے ہو کہ وہ دن تمہاری یادداشت پر ان مٹ ہو چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی بات کو تم نے غیر اہم سمجھا ہو اور وہ بات رہ گئی ہو اس لئے میں تمہیں یہ زحمت دینا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کوئی نہایت غیر اہم تفصیل بھی نہ چھوڑو.... سب کچھ بیان کر دو۔"

جواد ٹہلتے ٹہلتے رکا اور ٹیپ ریکارڈر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے دوبارہ ریکارڈر کا بٹن دبایا اور بولنا شروع کیا "میں اس روز اسکول سے چھٹی کے بعد تیمور اسٹور گیا.... معمول کے مطابق کام کرنے کے لئے۔ آقائے تیمور کچھ خفا تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے نوکری سے نکال رہے ہیں اس لئے کہ میں شام کو فٹ بال کھیلنے کے لئے بھی وقفہ کرتا ہوں۔ اب میں کیا کرتا۔ میں اسکول کی ٹیم میں تھا۔ فٹ بال کی بنیاد پر میری فیس معاف کی گئی تھی۔ خیر.... تو خاتون نازنین نے آقائے تیمور کی بات سن لی پھر جب میں ان کا سودا کار میں رکھ رہا تھا تو انہوں نے مجھ سے کہا...."

○

ٹرین نو بجے سمنان پہنچی۔ وہ چالیس منٹ لیٹ تھی۔ اس دوران میں کمال کی پریشانی میں کمی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اسے یہ احساس مسلسل ستا رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس کی چھٹی حس مسلسل اسے خبردار کر رہی تھی اور وہ پریشان ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے سوچا، ممکن ہے جواد اصغر کی سزائے موت جیسے جیسے قریب آ رہی ہے،

اس کے اعصاب پر اضافی بوجھ پڑ رہا ہو۔ اخبارات میں نازنین کی تصویریں صفحہ اول پر شائع ہو رہی تھیں۔ اس کے ساتھ جواد اصغر کی تصویر بھی ہوتی تھی۔ وہ خوش شکل لڑکا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے۔

ٹرین میں سفر کے دوران میں کمال اخبار میں چھپی نازنین کی تصویر کو مسلسل دیکھتا رہا تھا۔ قتل والے دن رپورٹر تصویر مانگتے رہے تھے.... اور اس نے اس تصویر کی کاپیاں بنا کر اسے دے دی تھیں۔ یہ اس کی پسندیدہ تصویر تھی نازنین کی۔ یہ تصویر اس نے خود کھینچی تھی۔ ہوا نازنین کے بالوں سے چھیڑ خانی کر رہی تھی اور وہ یوں ہنس رہی تھی' جیسے ہوا اسے گدگدا رہی ہو۔ اس کے گلے میں اسکارف تھا۔ بعد میں ایک دن کمال کو احساس ہوا کہ یہ وہی اسکارف تھا' جس کے ذریعے جواد نے نازنین کا گلا گھونٹا تھا۔

کمال ٹرین سے تیزی سے اترا۔ باہر پارکنگ لاٹ میں اس کی کار کھڑی تھی۔ اس نے کار پر سے برف جھاڑنے کی کوشش کی۔ ونڈ شیلڈ پر برف کی خاصی دبیز تہہ جم گئی تھی۔ اس نے ڈکی کھول کر اسکریپر نکالا۔

اسے وہ آخری موقع یاد آیا' جب اس نے نازنین کو جیتا جاگتا دیکھا تھا۔ وہ اسے گھر سے اسٹیشن پہنچانے کے لئے آئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اسپیئر وہیل موجود نہیں ہے۔ اس کے پوچھنے پر نازنین نے اعتراف کیا کہ گزشتہ رات وہیل برسٹ ہوا تھا اور گزشتہ رات وہ اپنی ماں سے ملنے قم گئی تھی۔

یہ سن کر وہ پھٹ پڑا تھا "جب ٹائر کی یہ کنڈیشن تھی تو تمہیں اس کو بدلوائے بغیر اتنا لمبا سفر نہیں کرنا چاہئے تھا۔" اس نے سخت لہجے میں کہا "جانم.... تمہاری یہ بے پروائی تمہارے لئے جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔"

".... جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔" اس کے کانوں میں اپنی آواز گونجی۔

"تم خفا مت ہو۔ میں نے وہ ٹائر پنکچر لگوانے کے لئے دیا ہے۔ آج نیا ٹائر بھی خرید لوں گی۔"

وہ اتنا خفا تھا کہ اسے خدا حافظ کہے بغیر کار سے اترنے لگا لیکن نازنین نے اس کا ہاتھ تھام لیا "غصہ مت کیا کرو۔ تمہیں نہیں پتا' میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔"

لیکن کمال نے نہ اس کی بات کا جواب دیا تھا' نہ ہی اسے نظر بھر کر دیکھا تھا۔ وہ اسٹیشن میں چلا گیا تھا۔ دفتر میں کئی بار اسے خیال آیا کہ نازنین کو فون کرے لیکن اس نے فون نہیں کیا۔ وہ نازنین کو باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی بے پروائیوں کو بہت سنگین سمجھتا ہے اور وہ اسی کی خاطر پریشان ہوتا اور غصہ کرتا ہے۔

اب اسے پچھتاوا ہوتا تھا کہ اس نے فون کیوں نہیں کیا؟ صلح کیوں نہیں کی؟ اس شام وہ اسٹیشن واپس آیا تو آقائے یزدانی اسٹیشن پر اس کے منتظر تھے۔ انہوں نے اسے بتایا کہ نازنین قتل کر دی گئی ہے۔ اب وہ کبھی اسے فون کر کے اس سے صلح نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے رابطہ توڑ گئی تھی۔

نازنین کے قتل کے بعد اس نے اس کی کار بیچ دی تھی۔ وہ اس کار کو دیکھتا تھا تو اس کے دل میں ہوک سی اٹھتی تھی' جو ٹیس بن جاتی تھی۔ جس رات نازنین قتل ہوئی' اس نے گیراج میں جا کر اس کی کار کو دیکھا۔ ٹائر آ گیا تھا۔ نیا ٹائر بھی اور پرانا بھی۔ اس کے علاوہ گاڑی کی سروس بھی اسی دن ہوئی تھی۔ اسپیئر وہیل ڈکی میں موجود تھا۔ گویا نازنین نے اس کی ناراضی کو سنجیدگی سے لیا تھا۔ اس نے فوراً اس کی خواہش کے مطابق عمل کیا تھا۔

'نازو.... میری نازو.... آئی ایم سوری۔' اس نے دکھی دل سے کہا تھا۔ نازو تک اب اس کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اس کے بعد اس کے دو سال اذیت اور تنہائی میں گزرے تھے۔ یہاں تک کہ اب سے تقریباً چھ ماہ پہلے جب اسے امروز میں مدعو کیا گیا تو اس کی ملاقات پروگرام کی دوسری مہمان شیریں پاشا سے ہوئی۔ شیریں نے اس کے دل میں پھر سے جینے کی امنگ جگا دی۔ اسے ایسا لگا' جیسے موسم بہار کا حیات بخش سورج نکل آیا ہے اور اس کے دل پر جمی ہوئی برف پگھلتی جا رہی ہے۔ اسے لگا کہ اسے خوشیوں نے ایک بار پھر موقع دیا ہے۔

ونڈ شیلڈ صاف ہو گیا تھا۔ کمال جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ جلال خیریت سے ہے اور وہ شیریں کو بانہوں میں بھر لینا چاہتا تھا۔

اپنے گھر کی سڑک پر مڑتے ہی اسے اندھیرے کا احساس ہوا۔ اس کے گھر میں اندھیرا تھا۔ ایک نامعلوم خوف اس کے دل پر چھانے لگا۔ اس نے کار کو ڈرائیو وے میں موڑا۔ شیریں کی کار وہاں موجود تھی۔ اس نے اپنی گاڑی شیریں کی گاڑی کے پیچھے کھڑی کی اور دروازے کی طرف جھپٹا۔ چابی کی مدد سے اس نے دروازہ کھولا اور بلند آواز میں پکارا ”جلال.... شیریں.... کہاں ہو بھئی؟“

ڈرائنگ روم میں قالین پر متعدد میگزین اور کچھ کاٹی گئی تصویریں بکھری ہوئی تھیں۔ قریب ہی قینچی بھی پڑی تھی۔ شاید جلال رسالوں میں سے تصویریں کاٹتا رہا تھا۔ آتش دان کے قریب میز پر اسے کوکو کی بھری ہوئی پیالی ملی‘ جس میں سے ایک گھونٹ بھی نہیں پیا گیا تھا۔ اس نے پیالی کو چھو کر دیکھا۔ وہ برف کی طرح سرد تھی۔ اسے رہ رہ کر احساس ہوتا رہا کہ کوئی بے حد خطرناک بات ہوئی ہے۔

اس نے اوپر‘ نیچے پورے گھر کا جائزہ لیا پھر دوبارہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں اس کی نظریں شیریں کے بیگ پر پڑیں۔ وہیں اس کا پرس بھی تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ ایسی کون سی بات ہو گئی کہ شیریں کو اپنا بیگ اور پرس بھی یاد نہیں رہا۔ شاید جلال کی طبیعت خراب ہوئی ہو گی۔ شاید دورہ بہت شدید ہو گا۔

اس نے جلدی سے ڈاکٹر کا نمبر ملایا۔ ڈاکٹر تو موجود نہیں تھا۔ نرس نے فون ریسیو کیا ”جی نہیں آقائے آفندی‘ ہمیں جلال بابا کی طبیعت کے متعلق کوئی کال نہیں ملی۔“

”تمہیں یقین ہے؟“

”جی جناب۔“

کمال نے اسپتال فون کیا۔ وہاں بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے کلاک کو دیکھا۔ نو بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اب سے تقریباً دو گھنٹے پہلے اس نے گھر فون کیا تھا۔ مگر کسی نے ریسیو نہیں کیا تھا۔ تو یہ لوگ کہاں ہیں؟ شیریں کا بیگ اور پرس بھی موجود ہے اور کار بھی پورچ میں کھڑی ہے۔ گویا وہ کہیں دور نہیں گئے ہیں۔ آقائے یزدانی....

دھڑکتے دل سے اس نے خالد یزدانی کے گھر کا نمبر ملایا۔ خدایا.... وہ دونوں وہاں موجود ہوں۔ وہ دل میں دعا کر رہا تھا۔

مگر پورا نمبر ملانے سے پہلے اسے میموری بورڈ پر چاک سے لکھا پیغام نظر آ گیا۔ بڑے اور بدنما حروف میں لکھا تھا ”.... اگر تم اپنے بچے اور محبوبہ کو زندہ اور بخیر و عافیت دیکھنا چاہتے ہو تو میری ہدایت کا انتظار کرو۔ پولیس سے رابطہ کرنے کی حماقت مت کرنا۔ عقاب!“

○

اسپیشل پولیس کے دفتر میں فیروز ہمدانی اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔ اس کے کندھے دکھ رہے تھے۔ گردن اکڑ گئی تھی۔ اب وہ پچاس سال کا ہونے والا تھا لیکن اس وقت وہ خود کو اسی سال کا بوڑھا محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید گھر پہنچ کر سکون ملے گا۔

اس نے کوٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آج پورے دن وہ ڈپریسڈ رہا تھا۔ اس لڑکے جواد اصغر کو اپنے ذہن سے نہیں جھٹک پا رہا تھا۔ دو سال پہلے وہ نازنین مرڈر کیس کا انچارج تھا اور اسی نے جواد اصغر کو تلاش کر کے گرفتار کیا تھا۔

اسے یاد تھا۔ لڑکا بڑی شدت سے انکار کرتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے قتل نہیں کیا بلکہ لڑکے کو جب اندازہ ہو گیا کہ اب بچت اسی میں ہی ہے کہ اعتراف جرم کر لے اور خود کو عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ اس نے اس وقت بھی اعتراف جرم نہیں کیا۔ وہ اپنی بے گناہی پر مصر تھا۔

فیروز نے کندھے جھٹک دیئے۔ اب معاملہ اس کے ہاتھ میں تھا بھی نہیں اور پرسوں لڑکے کو پھانسی ہونا تھی۔

وہ لفٹ کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ کسی نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کا ایک ماتحت لپکتا ہوا آ رہا تھا ”سر.... کمال آفندی کا فون ہے۔ آپ کو وہ یاد ہیں نا.... نازنین آفندی کے شوہر....“

”وہ تو میں جانتا ہوں مگر بات کیا ہے؟“ فیروز نے خشک لہجے میں پوچھا۔

”ان کا کہنا ہے کہ ان کے بیٹے جلال اور ان کی رائٹر دوست شیریں پاشا کو کسی نے اغوا کر لیا ہے۔“

○

"یہ تصویریں کس نے لی ہیں؟" شیریں نے دیکھا کہ اس کے لہجے کے خوف نے اجنبی کو چونکا دیا ہے۔ اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ رخسار کی نس اور زیادہ پھڑکنے لگی۔ شیریں نے جلدی سے بات بنائی۔ "میرا مطلب ہے، بہت حقیقی تصویریں ہیں۔"

وہ کچھ پرسکون ہوا "ممکن ہے، مجھے کہیں سے ملی ہوں۔"

شیریں کو کار میں ہونے والا وہ روشنی کا جھماکا یاد آیا، جس سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں "اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تصویریں تم نے لی ہوں؟" اس نے لہجے کو ستائشی بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے۔" وہ اور پرسکون ہو گیا۔

شیریں نے اس کے ہاتھ کو اپنے بالوں پر.... اور پھر رخساروں پر محسوس کیا۔ خوف زدگی ظاہر مت کرو۔ وہ خود کو دیوانہ وار سمجھانے لگی۔ جلال اب بھی اس کی بانہوں میں تھا۔ جلال کا جسم لرز رہا تھا۔ اکھڑتی سانسیں اس کی سسکیوں کو توڑے ڈال رہی تھیں "جلال.... روؤ مت۔" اس نے اسے چمکارا اور پھر نظریں اٹھا کر اپنے صیاد کو دیکھا۔ "یہ بہت خوف زدہ ہے۔ اسے کھول دو۔"

"اگر میں اسے کھول دوں تو تم مجھے پسند کرو گی؟" اس کی ٹانگ اس کے جسم کو دبا رہی تھی۔

"بالکل پسند کروں گی۔ یقیناً کروں گی لیکن پلیز، اسے کھول دو۔" شیریں انگلیوں سے جلال کی پیشانی سہلا رہی تھی۔

"آنکھوں کی پٹی کو مت چھونا۔"

"نہیں چھوؤں گی۔" شیریں کے لہجے میں حلاوت تھی۔

"تو ٹھیک ہے۔ اس کے ہاتھ کھول دو لیکن تم دونوں کو بیک وقت آزاد رکھنا میرے حق میں اچھا نہیں ہے۔ تم بچے کو چھوڑو اور پلنگ پر لیٹ جاؤ۔"

حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اجنبی صیاد نے اس کے دونوں پاؤں باندھے پھر اسے پلنگ پر بٹھا دیا پھر اس نے جلال کے ہاتھ کھول دیئے۔ بچے کے ہاتھ سامنے کی طرف ادھر ادھر ٹٹولنے والے انداز میں.... حرکت کر رہے تھے۔ اس کی سانسیں اب بھی شور مچا رہی تھیں۔

شیریں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور اپنے کوٹ میں چھپا لیا۔ وہ ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا "جلال.... پرسکون ہو جاؤ۔" شیریں کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا "تمہیں یاد ہے، دمے کے دورے کی صورت میں تمہارے بابا جانی نے تمہیں کیا سمجھایا ہے۔ خود کو ساکت کر لو اور سانس آہستہ آہستہ لو۔" اس نے سر اٹھا کر اجنبی صیاد کی طرف دیکھا "پلیز.... اس کے لئے پانی چاہئے۔"

اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور ٹپ ٹپ کرتے نل کی طرف بڑھا۔ اس کی پشت شیریں کی طرف تھی۔ شیریں نے سر اٹھا کر دیوار پر چسپاں تصویروں کو دیکھا۔ اسے خیال ہوا کہ یہ ان عورتوں کی تصویریں ہیں جنہیں اجنبی نے قتل کیا ہو گا۔ آخر کس قسم کا دیوانہ ہے وہ؟ اور اس نے اسے اور جلال کو کیوں اغوا کیا ہے؟ یہ طے ہے کہ اس نے اس اغوا کے لئے نہایت باریک بینی سے منصوبہ بندی کی ہے۔

جلال کو پھندا لگا اور پھر کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا اس لئے اجنبی سنک سے پلٹا اور اس نے پانی کی پیالی شیریں کو لا کر دی "اس سے کہو کہ یہ اپنی کھانسی روکے۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔

شیریں نے پیالی جلال کے ہونٹوں سے لگا دی۔ "لو یہ پیو...." جلال ایک دم سے پانی پینے لگا "گھونٹ.... گھونٹ.... اور پیچھے کی طرف ہٹ کر۔" شیریں نے اسے سمجھایا۔

جلال نے پانی ختم کیا اور آہ بھری۔ شیریں کو اس کے جسم کا تناؤ کم ہوتا محسوس ہوا "یہ ہوئی نا بات۔ اب تم بہتر ہو گئے۔" شیریں نے کہا۔

اجنبی صیاد شیریں پر جھک گیا۔ "تم بہت نرم دل اور مہربان ہو شیریں۔" وہ بولا "اس لئے میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں اس لئے بھی کہ تم مجھ سے خوف زدہ نہیں ہو۔ تم خوف زدہ تو نہیں ہو نا مجھ سے۔"

"نہیں، بالکل نہیں مگر یہ بتاؤ کہ تم ہمیں یہاں کیوں لائے ہو؟"

وہ جواب دیئے بغیر سیاہ سوٹ کیس کی طرف بڑھا۔ اس نے اسے آہستگی اور احتیاط سے اٹھایا اور لے جا کر دروازے سے چند فٹ پیچھے رکھ دیا پھر وہ جھک کر بیٹھ گیا اور اس نے سوٹ کیس کو کھولا۔

"اس میں کیا ہے؟" شیریں نے پوچھا۔

"ہے ایک چیز' جسے میں جانے سے پہلے تیار کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"اس طرح کے کام کے دوران میں بات کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔"

شیریں کا جسم تن گیا۔ جلال کے گرد اس کے بازوؤں کی گرفت سخت ہو گئی۔ وہ دیوانہ آتش گیر مادے سے کھیل رہا تھا۔ اگر اس سے ذرا سی بھی غلطی ہو گئی.... کوئی غلط تار مل گیا تو.... تو یہاں کچھ بھی نہیں رہے گا۔

وہ دل میں دعا کرتی ہوئے اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ بہت انہماک اور احتیاط سے کام کر رہا تھا۔ ادھر شیریں کے جسم سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ پیروں کی بندشیں سخت ہو گئی تھیں اور اس کا دوران خون متاثر ہو رہا تھا۔

بالآخر اجنبی نے اپنا کام مکمل کیا اور اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ "ہاں... اب ٹھیک ہے۔"

"تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟"

"یہ تمہاری نگرانی کرے گا۔ مجھے جانا ہے۔ اب میں کل صبح آؤں گا اور میں تمہیں اور بچے کو کھونا نہیں چاہتا۔ یہ اس کی ضمانت ہے۔"

"لیکن ہم یہاں اکیلے ہیں اور تم نے ہمیں باندھا ہوا ہے۔ تو ہم کہاں جا سکتے ہیں۔ کیسے کھو سکتے ہیں؟"

"میں بعید ترین امکان کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ فرض کرو' میری غیر موجودگی میں کوئی اس کمرے میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب میں نے اس دروازے میں تار لگا دیا ہے۔ کوئی ایسی کوشش کرے گا تو...."

"تم ہمیں یہاں کب تک رکھو گے؟"

"بدھ تک۔ تم فکر نہ کرو شیریں۔ کل رات کمال آفندی مجھے تین لاکھ اٹھائیس ہزار تومان ادا کر دے گا پھر بدھ کی صبح میں اور تم کہیں دور چلے جائیں گے اور میں کمال آفندی کو بتا دوں گا کہ اس کا بچہ اسے کہاں ملے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

شیریں کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اجنبی اس کی طرف بڑھا "مجھے افسوس ہے شیریں۔ اس نے بڑی پھرتی سے جلال کو شیریں کی گود سے جھپٹ لیا اور اسے پلنگ پر پٹخ دیا۔ شیریں کے ہلنے سے پہلے ہی وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پشت کی طرف لے گیا اور اس کی دونوں کلائیاں ڈوری سے باندھ دیں۔

پھر اس نے جلال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"پلیز.... اس کے منہ میں کپڑا نہ ٹھونسنا۔" شیریں نے التجا کی۔ "اسے کچھ ہو گیا تو تمہیں رقم نہیں مل سکے گی۔ دیکھو نا.... تاوان وصول کرنے کے لئے پہلے تمہیں اس کی زندگی کا ثبوت دینا ہو گا۔ پلیز.... دیکھو' تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ تم بہت اسمارٹ اور ذہین ہو۔ میں تمہیں کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں۔"

وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا.... سوچ میں ڈوبی نظروں سے۔

"تمہیں میرا نام معلوم ہے لیکن مجھے تمہارا نام نہیں معلوم اور میں چاہتی ہوں کہ تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے بارے میں سوچتی رہوں۔"

اجنبی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنی طرف گھمایا۔ وہ بڑے کھردرے اور سخت ہاتھ تھے۔ وہ اس پر جھکا۔ اس کی گرم سانسیں شیریں کو ناگوار محسوس ہو رہی تھیں۔ شیریں نے دل پر جبر کر کے اس کی قربت برداشت کی۔ "میرا نام عقاب ہے۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

اجنبی نے جلال کی کلائیاں باندھیں اور اسے شیریں کے پاس دھکیل دیا۔ پلنگ اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ دونوں اس پر آرام سے لیٹ پاتے۔ اس نے دونوں کے جسم کو کوٹ سے ڈھانپ دیا۔ "اور میں تمہارے چلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" اس نے کہا "ہو سکتا ہے' کوئی تمہاری آواز سن ہی لے۔"

اس نے ان دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیئے لیکن پہلے جیسے سخت نہیں۔ اب اس کے جسم کا تناؤ بتا رہا تھا کہ وہ پھر نروس ہو رہا ہے۔ وہ بڑی احتیاط سے ایک پتلا تار سوٹ کیس میں کسی چیز سے باندھ رہا تھا پھر وہ اس تار کو بڑی احتیاط سے دروازے تک لے گیا۔ وہ اس تار کو دروازے کے باہر کسی چیز سے اٹکانے والا تھا۔ شیریں سمجھ گئی' اب کسی نے باہر سے دروازہ کھولا تو کمرے میں موجود بم پھٹ جائے

گا۔

شیریں کو سوئچ دبنے کی آواز سنائی دی اور لائٹ آف ہو گئی۔ دروازہ بے آواز کھلا اور فوراً ہی بند ہو گیا۔ کمرے میں اب اندھیرا تھا اور سناٹا۔ جلال کی اکھڑی اکھڑی سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ کبھی کسی ٹرین کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

شیریں سوچ رہی تھی کہ قبر کی تاریکی اور سناٹا کیا ایسا ہی ہوتا ہے!

○

خالد اور نسرین یزدانی اوپر والے کمرے میں گیارہ بجے والی خبریں دیکھنے کے لئے بیٹھے تھے۔ خبریں دیکھنے کے بعد وہ بیڈ روم میں آئے۔ خالد نے سامنے والی کھڑکی کھولی کیونکہ تازہ ہوا کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ قدرتی طور پر اس کی نگاہ کمال آفندی کے گھر کی طرف اٹھی۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ گھر کے اندر بھی اور باہر بھی۔ اسے ڈرائیو وے میں کئی کاریں کھڑی نظر آئیں۔

وہ نسرین کی طرف مڑا "تم پریشان ہو رہی تھیں نا۔ اس وقت کمال آفندی کا گھر جگمگا رہا ہے' جیسے کوئی تقریب ہو۔"

"مہمان آئے ہوں گے۔ شکر ہے کہ میں اس وقت اپنے گھر میں ہوں۔ ایسے میں کہیں آنا جانا بہت گراں گزرتا ہے۔ کیسی سردی ہے اور میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔" اس کے چہرے کا تاثر اچانک بدل گیا۔ اس کا جسم تن گیا۔

"کیا ہوا؟ تکلیف ہو رہی ہے؟"

"ہاں۔"

"تم لیٹ جاؤ۔" خالد نے بیڈ کے سرہانے رکھی ہوئی نائٹروگلیسرین کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا جو ہر وقت وہاں موجود رہتی تھی۔ اس نے ایک ٹیبلٹ نکال کر نسرین کو دی۔ نسرین نے ٹیبلٹ کو زبان کے نیچے رکھ لیا پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔

ایک منٹ بعد نسرین نے گہری سانس لی اور آنکھیں کھول دیں۔" شدید درد ہوا تھا مگر اب میں ٹھیک ہوں۔"

فون کی گھنٹی بجی۔ خالد نے بدمزگی سے بڑبڑاتے ہوئے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا "کچھ لوگ وقت کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ خوامخواہ بے وقت...." اس نے ریسیور اٹھایا اور بڑی بے رخی سے کہا "یس؟"

مگر اگلے ہی لمحے اس کا لہجہ بدل گیا "کیا بات ہے کمال۔ خیر تو ہے؟" وہ چند لمحے سنتا رہا "اوہ.... خدایا.... میں ابھی آتا ہوں۔"

نسرین اسے پرتشویش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ خالد نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور نسرین کے ہاتھ تھام لئے۔ "جلال اور شیریں پاشا غائب ہو گئے ہیں۔" اس نے محتاط لہجے میں کہا "میں کمال کے گھر جا رہا ہوں۔ جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔"

"خالد...."

"پلیز نسرین، تم پرسکون رہو۔ خدا کے لئے۔"

خالد نے جلدی سے ایک بھاری سوئیٹر الماری سے نکال کر پہنا۔ وہ باہر نکل ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس نے سوچا۔ یہ فون نسرین ریسیو کر لے گی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کا رخ کمال کے گھر کی طرف تھا۔

کمال کے گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ہانپ رہا تھا۔ دروازہ ایک ایسے شخص نے کھولا جس کے سر کے بال آدھے سفید ہو چکے تھے۔ وہ بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"میں فیروز ہمدانی ہوں۔ شاہ کی اسپیشل پولیس سے میرا تعلق ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو، ہم دو سال پہلے بھی ملے تھے۔"

خالد یزدانی کو وہ دن یاد آیا، جب جواد اصغر نے یہاں سے بھاگتے ہوئے نسرین کو گرا دیا تھا اور بعد میں نسرین نے یہاں آ کر نازنین کی لاش دریافت کی تھی۔ "مجھے یاد ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہاں کمال اسے آتش دان کے پاس کھڑا نظر آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ بہ مشکل اپنی سسکیوں پر قابو پا رہا تھا۔ سائرہ کاؤچ پر بیٹھی تھی۔ آفاق اس کے برابر بیٹھا تھا۔

خالد، کمال کی طرف گیا اور اس کے کندے تھامتے ہوئے کہا۔ "کمال.... میں بتا نہیں سکتا کہ مجھے کتنا افسوس ہوا ہے۔ وہ کتنی دیر سے غائب ہیں؟"

"یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال یہ چھ بجے اور سات بجے کے درمیان کی بات ہے۔" کمال کی آواز بکھرنے لگی "وہ دونوں گھر پر اکیلے تھے۔"

"آقائے یزدانی۔" فیروز ہمدانی نے مداخلت کی "آپ ہمیں کچھ بتا سکتے ہیں۔ آپ

نے یہاں کسی اجنبی کو تو نہیں دیکھا، کوئی ایسی کار، کوئی ٹرک....؟"

خالد صوفے پر بیٹھ گیا۔ 'کوئی ایسی بات تھی تو سہی۔ سوچو یاد کرو، اس نے خود سے کہا۔ تھی تو کوئی بات.... ہاں یاد آیا۔ "تمہارے گھر کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔" اس نے کمال سے کہا۔

کمال تیزی سے اس کی طرف مڑا "آفاق اور سائرہ گھر سے گئے تو باہر بھی روشنی تھی۔ انہیں پورا یقین ہے اور جب میں واپس آیا تو یہاں اندھیرا تھا۔ آپ نے کس وقت یہاں اندھیرا دیکھا تھا، کچھ یاد ہے؟"

خالد ایک منظم اور مرتب ذہن کا مالک تھا۔ اسے پورا ٹائم ٹیبل یاد تھا۔ "دیکھو.... میں سوا چھ بجے گھر آیا تھا۔ اس وقت تمہاری لائٹ آن ہو گی ورنہ میں ضرور چونکتا۔ پھر نسرین نے مجھے جام بنا کر دیا اور مجھے آئے ہوئے زیادہ سے زیادہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ میں نے اور نسرین نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر تمہارے گھر کی طرف دیکھا۔ اس وقت نسرین نے مجھے احساس دلایا کہ تمہارے گھر میں اور گھر کے باہر اندھیرا ہے۔" وہ کہتے کہتے رکا "ہاں.... نسرین نے تمہارے ڈرائیو وے سے ایک کار باہر آتے دیکھی تھی۔"

"کیسی کار؟" فیروز ہمدانی نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔ اس وقت کھڑکی کی طرف میری پشت تھی۔"

خالد کو یاد تھا کہ نسرین وہ کار دیکھ کر پریشان ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جا کر جائزہ لے آئے۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ نسرین کو کس حد تک بتایا جائے۔ اس نے کمال کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بظاہر پرسکون لگ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر پھر وہی پریشانی اور دکھ لکھا نظر آ رہا تھا جو ابھی چھ ماہ پہلے مٹنا شروع ہوا تھا۔ جو خالد دو سال تک اس کے چہرے پر دیکھتا رہا تھا۔

"تم کچھ پیو گے کمال؟" اس نے پوچھا "کافی پی لو۔ تمہارا بہت برا حال ہو رہا ہے۔"

"ہاں.... کافی پی لوں گا۔"

سائرہ تیزی سے اٹھی۔ "میں کافی بناتی ہوں میرے خدا.... میں جلال کو چھوڑ کر

فلم دیکھنے گئی ہی کیوں۔ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی....“

آفاق نے جلدی سے بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ”خدا کے لئے‘ آج تو چپ ہی رہو۔ کیوں بری بات منہ سے نکالتی ہو۔“ وہ چلایا۔

خالد نے دیکھا کہ فیروز ہمدانی ان دونوں کو بڑی کشیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ کیا ان پر شبہ کر رہا ہے؟ کیا اس کی گنجائش ہے؟ نہیں بھئی.... ناممکن۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اسی وقت اطلاعی گھنٹی بجی اور بجتی چلی گئی۔ وہ سب بری طرح چونک گئے۔ فیروز کا ایک ماتحت دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھلا تو نسرین کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے لباس اور بالوں پر برف کے ذرات جمے تھے۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا اور آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔

خالد یزدانی تیزی سے اس کی طرف لپکا اور گرنے سے پہلے اسے تھام لیا ”کیا ہوا نسرین؟“

”خالد.... وہ.... وہ فون کال....“ نسرین نے سسکیوں کے درمیان کہا ”اس نے کہا کہ میں پیغام نوٹ کر لوں.... وہ کہہ رہا تھا.... لفظ بہ لفظ نوٹ کر لو۔ کوئی غلطی نہ کرنا ورنہ جلال.... جلال....“ اس سے بات پوری نہیں کی گئی۔

خالد نے انگلیوں میں دبے کاغذ کو اس کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ پھر فیروز کی طرف بڑھا دیا۔ جو اس کے پاس ہی آ کھڑا ہوا تھا۔

فیروز ہمدانی نے کاغذ کی تحریر کو بہ آواز بلند پڑھا ”کمال آفندی کو بتا دو کہ اسے اپنے بیٹے اور محبوبہ کی زندگی عزیز ہے اور وہ ان کی واپسی چاہتا ہے تو کل صبح ٹیلی فون بوتھ نمبر22 میں پہنچ جائے....“ آخری لفظ پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ فیروز نے نسرین یزدانی سے پوچھا۔ ”خاتون.... یہ آخر میں کیا لکھا ہے آپ نے؟“

”وہ بہت جلدی کر رہا تھا اور میں خوف زدہ تھی‘ لکھا نہیں جا رہا تھا.... یہ عقاب لکھا ہے۔“ نسرین کے چہرے پر اذیت کا تاثر لہرایا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا ”وہ.... وہ آواز بدلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب اس نے عقاب کہا تو میں.... مجھے پتا ہے‘ میں نے وہ آواز کہیں سنی ہے۔ وہ کوئی ایسا شخص ہے‘ جسے میں

جانتی ہوں۔“

○

فرید صادق نے جیل سے نکلتے ہی یاسمین قزلباش کو فون کیا ”میں تم سے ملنے تمہارے آفس آنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

یاسمین اسسٹنٹ پروسیکیوٹر تھی۔ وہ دونوں تین ماہ سے مل رہے تھے۔ یاسمین بھی جواد اصغر کی زندگی بچانے کے لئے فرید صادق کی جنگ میں شامل ہو گئی تھی۔ ”ٹھیک ہے آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

”کسی اعتماد کے ٹائپسٹ کو بھی روک لینا۔“

وہ وہاں پہنچا تو یاسمین ٹائپسٹ کے ساتھ اس کی منتظر تھی۔ ”ساحرہ نے کہا کہ ضرورت پڑی تو یہ پوری رات بھی رک سکتی ہے۔“ یاسمین نے ٹائپسٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اب یہ بتاؤ کہ کچھ حاصل بھی ہوا؟“

”بہت کچھ.... میں نے جواد سے چار مرتبہ سب کچھ سنا۔ میرے پاس دو گھنٹے کا ٹیپ ہے‘ جسے کاغذ پر منتقل کرنا ہے۔“

ساحرہ نے فرید کی طرف ہاتھ بڑھایا ”مجھے دیجئے۔ میں کام شروع کر دوں۔“

”شکریہ۔“ فرید نے دو کیسٹ ساحرہ کو دیئے اور پھر یاسمین کی طرف مڑا ”تم نے وہ فائلیں نکالیں‘ جن کے متعلق کل بات کی تھی؟“

”ہاں‘ وہ اندر ہیں۔“ یاسمین نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

فرید اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ میز پر چار فائلیں رکھی تھیں۔ ”سب سے اوپر پولیس رپورٹس ہیں۔“ یاسمین نے کہا ”لیکن فرید‘ پروسیکیوٹر کو معلوم ہو گیا تو وہ بہت خفا ہو گا۔ میری ملازمت بھی جا سکتی ہے۔“

فرید نے یاسمین کو بہت غور سے دیکھا۔ دیکھنے میں وہ پچیس سالہ وکیل کے بجائے کوئی نوخیز لڑکی لگتی تھی لیکن کورٹ میں اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اندازہ ہوتا تھا کہ بے ضرر نظر آنے والے لوگ زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ فرید جانتا تھا کہ یاسمین بے حد قابل وکیل ہے۔ اس کا تاریخ قانون کا اور کیسوں کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور خوبی کی بات یہ تھی کہ وہ انصاف کی حامی تھی۔ وہ بہت اچھی وکیل ثابت ہو سکتی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔" فرید نے چند لمحے غور کرنے کے بعد کہا۔ "کہ تم بڑا خطرہ مول لے رہی ہو لیکن اگر ہم قتل کی تینوں وارداتوں اور نازنین آفندی کے قتل کے درمیان کوئی مشترکہ کڑی تلاش کرلیں تو.... یہ واحد امکان ہے جواد اصغر کی بچت کا۔"

"اچھا.... بیٹھو تو۔"

فرید کرسی پر بیٹھ گیا۔ یاسمین سامنے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے دو فائلیں اپنی طرف کھینچیں۔ "اخبار والے ان دونوں وارداتوں کو خدمت مرڈر کا نام دے رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"فردوس جلال اور بیگم کاشانی دونوں کے پاس سی بی ریڈیو تھے اور دونوں نے مدد کے لئے کال کیا تھا۔ بیگم کاشانی کی گیس کی سپلائی رک گئی تھی اور فردوس جلال نے کار خراب ہونے کی اطلاع دی تھی۔"

"اور دو سال پہلے رخسار جلالی اور افشاں مجیدی کو اس وقت قتل کیا گیا' جب وہ سنسان سڑک پر تنہا ڈرائیو کر رہی تھیں۔"

"لیکن ان میں کوئی رابطہ تو نظر نہیں آتا۔"

"وہی تو تلاش کرنا ہے ہمیں۔"

"دیکھیں.... جواد اصغر کی گرفتاری کے بعد عورتوں کے قتل کا سلسلہ رک گیا تھا اور اب پچھلے مہینے یہ دو قتل ہوئے۔ ان کا مجرم ابھی تک پکڑا نہیں جا سکا ہے۔ یہ سی بی ریڈیو بڑی سہولت ہیں لیکن یہ تو پاگل پن ہے کہ کوئی عورت اس پر اپنے تنہا ہونے کا اعلان کرے.... خاص طور پر یہ کہ وہ ایک سنسان سڑک پر اکیلی ہے اور اس کی کار خراب ہو گئی ہے۔ یہ تو ریڈیو سننے والے کسی بھی جنونی کے لئے دعوت ہے.... کھلی دعوت!"

"مجھے یقین ہے کہ قتل کی ان تمام وارداتوں اور نازنین آفندی کے قتل کے درمیان ضرور کوئی تعلق ہے۔" فرید نے زور دے کر کہا "اب تم چاہو تو اسے میری چھٹی حس سمجھ لو لیکن مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں مگر کیسے کروں؟"

"ہم ایک فہرست مرتب کریں گے.... جگہوں کی' وقت کی۔ موت کے سبب کی.... آلہ قتل کی... اور کاروں کی پھر ہم ہر بات کا موازنہ نازنین آفندی مرڈر کیس کی تفصیلات سے کریں گے۔ شاید کوئی کڑی مل جائے۔"

انہوں نے آٹھ بج کر دس منٹ پر کام شروع کیا۔ بارہ بجے کے قریب ساحرہ کاغذات لئے ہوئے آئی "میں نے پوری گفتگو کاغذ پر منتقل کرلی ہے۔" اس نے کہا "ایک بات بتاؤں۔ اس لڑکے کی باتیں سنتے ہوئے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ مجھے اس محکمے میں کام کرتے ہوئے بیس سال ہو گئے۔ دل سخت ہو گیا ہے میرا۔ کسی بات کا.... کسی بیان کا اثر نہیں ہوتا مجھ پر۔ اب تک سیکڑوں ہزاروں ایسے بیان سن چکی ہوں مگر مجھے یقین ہے کہ یہ لڑکا جھوٹا نہیں ہے۔ یہ قاتل بھی نہیں ہے۔"

فرید اور یاسمین کام میں جتے رہے۔ وہ بہت باریک بینی سے تفصیلات کا موازنہ کر رہے تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ صبح ہونے کو تھی کہ یاسمین نے کہا "اب بس کر دو۔ مجھے صبح آٹھ بجے کورٹ پہنچنا ہے اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ کوئی تمہیں یہاں دیکھے۔"

فرید نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اب تو اسے بھی لکھے ہوئے حروف تیرتے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے واردات والے دن جواد اصغر کی مصروفیات اور اس دن کی تفصیلات کے بارے میں جواد اصغر کے ٹیپ شدہ چاروں بیانات کے ایک ایک لفظ کا موازنہ کیا تھا۔ انہوں نے وقت کو خاص طور پر اہمیت دی تھی۔ وہ وقت جب نازنین نے اسٹور میں جواد سے بات کی تھی اور پھر وہ وقت جب گھبرایا ہوا جواد بھاگتے ہوئے نسرین یزدانی سے ٹکرایا تھا اور اسے گرا کر رکے بغیر بھاگ گیا تھا لیکن چاروں بیانوں میں کہیں کوئی فرق نہیں تھا۔

"مجھے یقین ہے' ان بیانات میں کوئی اہم بات چھپی ہوئی ہے۔" فرید نے ضدی پن سے کہا "میں یہ سب دستاویزات ساتھ لے کر جاؤں گا۔ میں ہار نہیں مانوں گا۔"

یاسمین نے سب چیزیں بریف کیس میں رکھنے میں اس کی مدد کی۔ فرید نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "مجھے تم سے محبت ہوتی جا رہی ہے یاسمین۔"

یاسمین کی آنکھیں چمکنے لگیں "مجھے تو پہلے ہی ہو گئی تھی۔ تم جس خلوص سے بغیر کسی لالچ کے اس یتیم لڑکے کو بچانے کی کوشش کر رہے ہو' وہ تمہاری عظمت کی

گواہ ہے۔"

"کاش.... ہمارے پاس مہلت ہوتی۔" فرید نے تڑپ کر کہا۔ "اور اگر اصل قاتل بعد میں پکڑ بھی لیا گیا تو بے قصور جواد کو کیا فائدہ ہو گا۔ وہ تو قانون کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہو گا۔ اچھا یاسمین، پھر ملیں گے۔"

وہاں سے فرید اپنے آفس میں چلا آیا۔ اس نے اپنے لئے کافی بنائی اور یکے بعد دیگرے چار پیالیاں پی گیا۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند ذرا چھٹی۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے سات بجے تھے۔ سزائے موت اب صرف 28 گھنٹے دور تھی۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ کوئی چیز اس کے شعور کے دروازے پر مسلسل دستک دے رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ کسی بہت اہم بات کو نظرانداز کر گیا ہے۔

○

خالد اور نسرین یزدانی اپنے گھر جا چکے تھے اور آفاق اور سائرہ دوسری منزل پر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ کمال، فیروز ہمدانی کے ساتھ ڈرائنگ روم کی میز پر بیٹھا تھا۔ فیروز کے ماتحت بڑی خاموشی اور مستعدی سے کام کرتے رہے تھے۔ انہوں نے پورے مکان میں فنگر پرنٹس تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ باہر انہوں نے قدموں کے نشان تلاش کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن بورڈ پر لکھے پیغام کے سوا مجرم نے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔

فیروز اپنی نوٹ بک میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "یہ ٹیلی فون بوتھ اسٹیشن روڈ پر ہے۔ ہم نے یزدانی کے، آپ کے اور اس بوتھ کے فون پر ٹیپ لگا دیا ہے۔ آپ اس عقاب سے فون پر بات کریں تو کال کو طوالت دینے کی کوشش کیجئے گا۔ یوں ہمیں اس کی آواز ریکارڈ کرنے کا بھرپور موقع ملے گا۔ بعد میں ہم اسے شناخت کرانے کی کوشش کر سکیں گے۔ ہمارا سب سے بڑا چانس یہ ہے کہ مادام یزدانی اس کی آواز سے اسے پہچان سکتی ہیں۔"

"یعنی تمہارے خیال میں اس بات کا قوی امکان ہے؟" کمال نے پوچھا۔

"کچھ بھی ممکن ہے۔ مادام یزدانی کے لہجے میں یقین تھا کہ وہ ان کی جانی پہچانی آواز ہے۔ آپ اس عقاب سے کہئے گا کہ پہلے اسے یہ ثبوت دینا ہو گا کہ آپ کا بیٹا

اور شیریں پاشا زندہ اور بخیریت ہیں۔ آپ کہئے گا کہ وہ ان کی آوازوں کا کیسٹ فراہم کرے اور وہ جو رقم بھی مانگے، آپ اسے دینے کا وعدہ کر لیں لیکن واضح کر دیں گے کہ جب تک آپ کو ان کی زندگی کا یقین نہیں ہو گا، آپ ادائیگی نہیں کریں گے۔"

"اس سے وہ آپے سے باہر نہ ہو جائے۔"

"نہیں۔ الٹا اس کا اعتماد بڑھے گا اور پریشانی کم ہو جائے گی۔ وہ اتنا اعصاب زدہ بھی نہیں رہے گا۔" فیروز ہمدانی نے ہونٹ بھینچے اور اپنی نوٹ بک بند کر دی۔ "آپ کے گھر کا آج کا جو شیڈول تھا، اس سے کون کون واقف تھا؟ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا آپ۔ یعنی یہ کہ آفاق اور سائرہ فلم دیکھنے جا رہے ہیں اور شیریں پاشا یہاں آ رہی ہیں۔"

"آفاق، سائرہ، جلال اور شیریں۔ ان کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ جلال نے اسکول میں اپنی کسی ٹیچر یا کسی دوست کو اس کے بارے میں بتایا ہو؟"

"ممکن ہے۔"

"مجھے علم ہے کہ آپ اور شیریں پاشا "امروز" نامی پروگرام میں ساتھ آئے تھے۔ آپ سزائے موت کے حامیوں میں سے ہیں جبکہ خاتون شیریں پاشا سزائے موت کو ختم کرانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کیا یہ نظریاتی اختلاف آپ کے ذاتی تعلقات پر اثر انداز ہوتا ہے؟"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟"

"سیدھی سی بات ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ خاتون شیریں پاشا جواد اصغر کی سزائے موت رکوانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایسے میں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اغوا محض ڈراما ہو اور خاتون اس کی مدد سے جواد کو بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"نہیں.... نہیں.... ہرگز نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں ہر زاویئے سے دیکھنا چاہئے لیکن پلیز.... خدا کے لئے.... ایسے نظریات پر وقت ضائع مت کرو۔ میں جانتا ہوں، شیریں یہ سب کچھ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور وہ بھی میرے ساتھ.... ناممکن!"

لیکن فیروز ہمدانی پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا "آقائے آفندی' میں نے کاز کے نام پر ایسے ایسے لوگوں کو جرائم کرتے دیکھا ہے' جن کے متعلق ایسا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ خاتون شیریں کا ڈراما ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کے بیٹے کو کوئی خطرہ نہیں۔"

"میں نے کہا نا' یہ ناممکن ہے۔" کمال نے خشک لہجے میں کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ اب اپنی ڈاک کے متعلق بتائیں۔ آپ کو دھمکیاں موصول ہوتی ہیں۔ آپ کے نام نفرت بھرے خط آتے ہیں؟"

"آتے ہیں کیونکہ میں اپنے اداریوں کے ذریعے سزائے موت کے حق میں تحریک چلا رہا ہوں اور اب جبکہ جواد اصغر کی سزائے موت کا وقت قریب آ رہا ہے تو ایسے خطوط کی تعداد بڑھ گئی ہے مگر اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔" یہ کہتے کہتے کمال کے چہرے پر سوچ کا تاثر ابھرا۔

"کیا ہوا؟ کوئی خاص بات؟" فیروز ہمدانی نے پوچھا۔

"یاد آیا۔ ابھی پچھلے ہفتے جواد اصغر کی ماں نے مجھے روک لیا تھا۔ میں ہفتے کو جلال کو دمے کا ٹیکا لگوانے کے لئے لے جاتا ہوں۔ ہم اسپتال سے نکلے تو وہ وہاں موجود تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں گورنر سے کہوں کہ وہ جواد کو معاف کر دے۔"

"آپ نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ جلال یہ باتیں نہ سنے چنانچہ میں نے منہ موڑ لیا۔ وہ سمجھی کہ میں اسے نظرانداز کر رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ اگر تمہارا بھی اکلوتا بیٹا تم سے اسی طرح چھینا جائے تو تم پر کیا گزرے گی۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔"

فیروز نے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھا "ہم اسے چیک کریں گے۔" پھر وہ اٹھا اور چند لمحے ہاتھ پیر کھولتا رہا "آقائے آفندی' یہ ذہن میں رکھیں کہ ہمارا مغویوں کو چھڑانے کا ریکارڈ بہت اچھا ہے اور ہم ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ چند گھنٹے سو لیں۔"

"سو لوں؟" کمال نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

"سو نہ سکیں تو سکون سے لیٹ جائیں۔ ہم یہیں رہیں گے اور اگر کوئی بات ہوئی تو آپ کو پکار لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔"

کمال پہلی منزل پر ماسٹر بیڈ روم میں چلا گیا۔ نازنین کی موت کے بعد اس نے کمرے کا پورا فرنیچر بدلوا دیا تھا۔ پرانا فرنیچر نازنین کی پسند کا تھا اور اسے نازنین کی یاد دلاتا تھا۔ اب وہ ایک تنہا مرد کا کمرا تھا۔

اس کمرے کا ہی نہیں' پورے گھر کا یہی حال تھا۔ وہاں ہر وقت تنہائی چیختی چلاتی' آہیں بھرتی تھی۔ وہ جذبوں سے محروم گھر تھا۔ انہوں نے جب اسے خریدا تھا تو سوچا تھا کہ وہ اسے اپنی محبت سے... اپنے جذبوں سے سجائیں گے۔ "مجھے صرف چھ مہینے دے دو۔" نازنین نے کہا تھا "میں اسے اس طرح سجاؤں گی کہ یہ تمہیں میرے.... اپنے خوابوں کا گھر لگنے لگے گا۔" لیکن زندگی نے اسے محض دو ہفتوں کی مہلت دی تھی۔

اور جب وہ شیریں کے اپارٹمنٹ میں گیا تو اس کی آرائش اور سلیقہ دیکھ کر اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ گھر کو محبت اور سلیقے سے سجایا جائے تو وہ سکون بخش بن جاتا ہے۔ اس نے سوچا' وہ شیریں کے ساتھ مل کر اپنے گھر کو گھر بنائے گا۔ دونوں بیٹھ کر سوچیں گے کہ اسے کیسے آراستہ کیا جائے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیریں کو گھر بنانے کا ہنر آتا ہے.... اور خوب آتا ہے مگر اس کے لئے یہ ایک خواب ہی ثابت ہوا۔

اس نے لائٹ آف کی اور بیڈ پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا۔ کھڑکیوں سے برف کے ٹکرانے کی آواز اسے بہت بری لگ رہی تھی۔

اسے کچھ دیر بعد اونگھ آ گئی۔ وہ خواب دیکھنے لگا۔ شیریں اور جلال اسے مدد کے لئے پکار رہے تھے۔ وہ ایک طویل راہداری میں دوڑ رہا تھا۔ اس راہ داری کے آخر میں ایک کمرا تھا۔ جہاں اسے جانا تھا مگر راہ داری ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

پھر اسے وہ کمرا نظر آیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ جلال اور شیریں اسے کمرے میں فرش پر پڑے نظر آئے۔ ان کے گلوں میں وہ اسکارف پڑے تھے' جن سے ان کے گلے گھونٹے گئے تھے۔ اسکارف بالکل ویسے تھے جیسا وہ سکارف تھا' جس سے نازنین کا گلا گھونٹ کر اسے قتل کیا گیا تھا۔

وہ گیارہ بجے شیریں اور بچے کو بند کر کے نکلا۔ ایسے وقت میں اوپر آتے ہوئے دیکھا جانا' اسے مشتبہ بنا سکتا تھا۔ لہٰذا وہ بہت محتاط تھا۔ بالآخر وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر اوپر پہنچ گیا۔ سیکیورٹی گارڈز کے معاملے میں خاص احتیاط برتی تھی۔

اس نے سڑک کی طرف نظر دوڑائی۔ وہاں ٹریفک پولیس کا ٹرک کھڑا تھا۔ ایک ٹریفک کانسٹیبل اس مسروقہ کار سے ہک منسلک کر رہا تھا' جس میں بٹھا کر وہ شیریں اور بچے کو یہاں تک لایا تھا۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر ہنس دیا۔ اسے کار کو کہیں چھوڑنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ یہ کام خود پولیس نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔

وہ باہر نکلا اور پیدل اسی بوتھ کی طرف چل دیا' جہاں سے اس کا فون کرنے کا ارادہ تھا۔ چلنے کے دوارن میں وہ اپنی وہ کیفیت یاد کرتا رہا' جو شیریں کا بوسہ لیتے ہوئے اس کی ہوئی تھی۔ کیسی خواہش مچلی تھی اس کے اندر اور وہ جانتا تھا کہ شیریں بھی اسے چاہتی ہے۔ اس کے انداز میں بلاوے تھے۔

اگر بچہ موجود نہ ہوتا تو وہ یقیناً اور آگے بڑھتا۔ ایسے بلاوے کو.... اور وہ بھی شیریں جیسی حسین عورت کا بلاوا.... کون نظر انداز کر سکتا ہے۔ لڑکے کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی لیکن آنکھیں تو بہرحال موجود تھیں اور سماعت بھی اور کیا پتا' لڑکا پٹی کے پار بھی دیکھ سکتا ہو۔ اس خیال نے اس کے جسم میں لرزش دوڑا دی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ براہ راست آفندی کو فون کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ سامنے کے گھر میں یزدانی رہتا تھا۔ اس کے گھر کا فون نمبر اس کے پاس تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یزدانی کو فون کرے گا۔

پہلی ہی گھنٹی پر مسز یزدانی نے فون ریسیو کیا۔ اس نے بھرائی ہوئی بھاری آواز میں اسے اپنا پیغام لکھوایا۔ اس آواز میں بولنے کی وہ بہت دنوں سے مشق کر رہا تھا لیکن خاتون کی سمجھ میں اس کا نام نہیں آ رہا تھا۔ جھنجلاہٹ اور غصے میں وہ نام دہراتے ہوئے اس کی آواز بلند ہو گئی اور وہ اپنی آواز میں بول اٹھا۔ یہ اس سے یقیناً غلطی ہوئی تھی مگر خاتون بہت پریشان تھی۔ وہ امید کر سکتا تھا کہ اس نے آواز پر دھیان نہیں دیا ہو گا۔

ریسیور رکھتے ہوئے وہ مسکرایا۔ اگر آفندی نے پولیس سے مدد طلب کی تو وہ یقیناً اس بوتھ میں ٹیپ لگائیں گے جہاں اس نے آفندی کو بلایا ہے مگر اس کے پاس اس کا علاج ہے۔ وہ آفندی کو فون کر کے صرف اتنا کہے گا کہ وہ فوراً 24 نمبر بوتھ میں پہنچے پھر وہ وہاں سے اس سے بات کرے گا اور کوئی ٹیپ نہیں کر سکے گا۔ اپنی چالاکی پر وہ خود ہی ہنسا اور ارم ہوٹل کی طرف چل دیا۔

کاؤنٹر پر وہی رات والا کلرک تھا۔ اس سے کمرے کی چابی لے کر وہ کمرے میں پہنچا اور روم سروس کو فون کر کے اپنے لئے کھانا منگوایا۔ کھانا کھانے کی بعد اس نے کھانا لانے والے کو فراخ دلی سے ٹپ دی۔ وہ ابھی سے امیر ہونے کی مشق کر رہا تھا۔

بیئر پیتے ہوئے وہ رات کی خبریں دیکھتا رہا۔ جواد اصغر کے متعلق بتایا جا رہا تھا۔ اس کی جاں بخشی کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔ اب سینٹرل جیل میں اسے بدھ کی صبح ساڑھے گیارہ بجے پھانسی دینے کے انتظامات کئے جا رہے تھے۔

اسے خوشی ہوئی کہ خبروں میں جلال اور شیریں کے اغوا کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ پبلسٹی اس کے کام کو اور مشکل بنا دیتی۔

پچھلے مہینے اس لڑکی کے معاملے میں اس سے غلطی ہوئی تھی مگر وہ کرتا بھی کیا۔ وہ تو احتیاط کرتا رہا تھا لیکن سی بی ریڈیو پر اس کا پیغام سن کر اس کا دل مچل اٹھا۔ خود پر قابو رکھنا ناممکن ہو گیا۔ یہ تو ایسا ہی تھا' جیسے کئی دن کے کسی بھوکے کو اطلاع دی جائے کہ فلاں جگہ دسترخوان بچھا ہے' جس پر اس کی پسند کی ہر ڈش موجود ہے۔ اس اکیلی لڑکی کے تصور سے بھی اسے خوشبو آ رہی تھی۔

اس نے ریڈیو آف کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا۔ اسے صبر کرنا چاہئے تھا مگر وہ کرتا بھی کیا۔

اس نے کوٹ کی جیب سے منی ٹیپ ریکارڈر اور وہ کیسٹ نکالے جو وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس نے ان میں سے ایک کیسٹ منتخب کیا اور اسے ریکارڈر میں لگا دیا پھر وہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔ لائٹ آف کرنے کے بعد اس نے ائر پلگ اپنے داہنے کان میں لگایا پھر ریکارڈر کا پلے کا بٹن دبا دیا۔

پہلے ایک کار کے چلتے ہوئے انجن کی آواز سنائی دی پھر بریک چرچرائے۔ کار کا

دروازہ کھلا اور اس کی اپنی آوازا سنائی دی۔ وہ دوستانہ انداز میں شیریں لہجے میں بات کر رہا تھا۔

اس نے کیسٹ چلنے دیا۔ وہ سنتا رہا۔ اب سب سے اچھا حصہ آنے والا تھا۔ اس حصے کو اس نے بار بار ریوائنڈ کر کے سنا۔ بالآخر اس نے ٹیپ ریکارڈر کا اسٹاپ کا بٹن دبایا' کان سے ائر پلگ نکالا اور لمحوں میں گہری نیند سو گیا۔ رخسار جلالی کی آخری چیخ....

"نہیں' پلیز نہیں..... چھوڑ دو مجھے...." اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

○

عائشہ اور خرم رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ مایوسی جیسے عائشہ کی روح میں سرایت کر گئی تھی "مجھے کار کی چوری کا اتنا دکھ نہ ہوتا۔" اس نے سسکتے ہوئے کہا "لیکن ہم نے ابھی تو اس کی مرمت پر اتنی رقم صرف کی تھی۔ اگر کسی کو کار چرانی تھی تو ایک ہفتہ پہلے چرا لیتا۔ کم از کم مرمت کی رقم تو بچ جاتی۔"

"کمال کرتی ہو۔ چور کو ان سب باتوں کا کیا پتا۔" خرم نے کہا۔

"سوچو تو۔ شہباز نے کتنی محنت کی تھی اس پر۔ بالکل نیا کر دیا تھا۔"

"تو شہباز نے اس کی اجرت بھی لی تھی۔ اس پر ترس کیوں کھاتی ہو۔"

"اب میں کل کام پر کیسے جاؤں گی۔ میری ملازمت تو گئی نا۔ عائشہ نے کہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ بچوں کا اسکول بہت دور تھا۔ پیسے بچانے کے لئے انہیں اتنی دور داخل کرایا تھا اور وہ انہیں اسکول پہنچائے بغیر کام پر نہیں جا سکتی تھی۔

"تمہاری ملازمت نہیں جائے گی۔ صبح میں کہیں سے قرض پکڑتا ہوں۔ شہباز کے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ کار بکنے کے لئے آئی ہے۔ وہ لے لیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

وہ سونے کے لئے لیٹ ہی رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ خرم نے فون ریسیو کیا "جی ہاں۔ میں خرم سعیدی بول رہا ہوں۔ مجھے خوشی ہوئی یہ سن کر...." وہ چند لمحے سنتا رہا۔ پھر بولا "کہاں؟ مذاق کر رہے ہیں آپ؟.... اوہ اچھا.... شکریہ۔ میں آتا ہوں۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟ کار مل گئی ہماری؟" عائشہ کی نیند اڑ گئی تھی۔

"ہاں.... تہران میں۔ اسٹیشن کے پاس غیر قانونی طور پر پارک کی گئی تھی۔ پولیس اسے اٹھا کر لے گئی۔ وہ کہتے ہیں' شاید لڑکے اس پر تفریح کرتے پھرے ہیں۔"

"تو اب؟"

"صبح ہمیں کار مل جائے گی۔"

"واہ وا۔ شکر ہے خدا کا۔" عائشہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

"لیکن ایک مسئلہ ہے۔" خرم نے پرخیال لہجے میں کہا "ہمیں جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ تین سو تومان۔"

"وہ کس بات کا؟" عائشہ کی بھویں تن گئیں۔

"پچاس تومان غیر قانونی پارکنگ کے اور پولیس کا ٹرک جو اسے اٹھا کر لے گیا' ڈھائی سو تومان اس کے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ ہماری کار تو چوری ہوئی تھی۔"

"کیا کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو دینا پڑے گا۔"

"یہ تو میری تنخواہ پہلے ہی خرچ ہو گئی۔"

"شکر ادا کرو' کار مل گئی۔ کار تین ہزار تومان کی تھی۔ اب مجھے صبح پانچ بجے اٹھنا پڑے گا۔"

وہ بڑی مشکل سے سوئے۔ خرم سوا پانچ بجے والی ٹرین سے تہران گیا اور پونے نو بجے اپنی کار میں واپس آیا "یہ لو اپنی کار۔"

عائشہ بچوں کو تیار کر چکی تھی۔ اس نے انہیں اسکول چھوڑا۔ نو بج کر دس منٹ پر وہ یزدانی ہاؤس کے ڈرائیو وے میں داخل ہوئی اور وہاں کھڑی کار کے برابر اپنی کار کھڑی کر دی۔ اسے یاد آتا تھا کہ پچھلے ہفتے وہ انٹرویو کے لئے آئی تھی تو یہ کار اس نے سڑک کے اس طرف کھڑی دیکھی تھی۔ ممکن ہے' ان کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہوں۔"

وہ کچھ نروس ہو رہی تھی۔ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ جھجکی۔ ملازمت کے پہلے دن کار چوری ہو جانا اچھا شگون نہیں تھا پھر اس نے خود کو سمجھایا' عین وقت پر کار واپس مل جانا تو بہت اچھا شگون ہے۔ اس نے بڑی محبت سے برابر والی سیٹ کو

پھڑپھڑایا۔

اچانک اس کا ہاتھ ٹھٹک گیا۔ اس کا ہاتھ کسی سخت چیز سے مس ہوا تھا۔ اس نے سر جھکا کر دیکھا۔ وہ چمک دار سی چیز سیٹ کشن اور بیک ریسٹ کے نچلے حصے کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے اسے کھینچ کر نکالا۔ وہ انگوٹھی تھی۔ خوب صورت نسوانی انگوٹھی۔ سونے کی اس انگوٹھی میں بے حد خوب صورت اور بڑا حجرا القمر جڑا تھا۔ اس نے سوچا' یہ یقیناً کار چرانے والے کی انگوٹھی ہے۔

وہ خوش ہوگئی۔ جرمانے کی تلافی ہوگئی تھی۔ انگوٹھی جرمانے سے زیادہ ہی مہنگی ہوگی۔ اس نے اپنا دستانہ اتارا اور انگوٹھی کو انگلی میں پہن کر دیکھا۔ لگتا تھا' انگوٹھی اس کی انگلی کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔

اچانک.... ایک لمحے میں وہ نہایت پراعتماد ہوگئی۔ وہ دروازہ کھول کر گاڑی سے اتری اور یزدانی ہاؤس کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

○

بوتھ نمبر22 میں ٹھیک آٹھ بجے فون کی گھنٹی بجی۔ کمال آفندی کو اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہوا۔ وہ نروس ہو رہا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا۔

''آفندی؟'' کسی نے بھرائی ہوئی دھیمی آواز میں پوچھا۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ سننے کے لئے سماعت پر زور دینا ضروری تھا۔

''بول رہا ہوں۔''

''پانچ منٹ کے اندر بوتھ نمبر24 میں پہنچو۔ وہاں بات ہوگی۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔

کمال بوکھلا کر باہر نکلا۔ وہ فیروز ہمدانی کے ساتھ اپنی گاڑی میں یہاں آیا تھا۔ فیروز سڑک پار کھڑا اپنے ایک ماتحت سے بات کر رہا تھا۔ کمال نے اسے پکارا۔ فیروز نے آنے کی کوشش کی لیکن ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ کمال کو ایک ایک لمحہ بھاری لگ رہا تھا۔ وہ اگلے بوتھ کی طرف چل دیا۔

''آفندی.... کیا ہوا؟'' عقب سے فیروز نے اسے پکارا۔ وہ سڑک پار کر چکا تھا۔

''اس نے مجھے بوتھ نمبر24 میں بلایا ہے۔''

''لعنت ہے۔ اتنی دیر میں ہم وہاں گفتگو ٹیپ کرنے کا اہتمام نہیں کر سکتے۔'' فیروز ہمدانی بھنا گیا۔

''میں اسے زیادہ سے زیادہ دیر گفتگو پر مجبور کروں گا۔ لفظ بہ لفظ لکھوں گا۔''

فیروز نے اثبات میں سر ہلایا لیکن' اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔

بوتھ نمبر24 میں فون کی گھنٹی بجی۔ کمال نے ریسیور اٹھایا ''میں آفندی بول رہا ہوں۔''

''میری بات غور سے سنو۔'' آواز اس بار بھی دھیمی تھی۔ کمال کو کان لگا کر سننا پڑ رہا تھا ''مجھے تین لاکھ اٹھائیس ہزار تومان چاہئیں۔ چھوٹے اور پرانے نوٹوں کی شکل میں۔ رات دو بجے' تہران کے پہلوی ایوینیو کے فون بوتھ نمبر59 کے باہر پہنچ جانا۔ اپنی گاڑی میں آنا اور اکیلے آنا پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ رقم کہاں پہنچانی ہے۔''

''تین لاکھ اٹھائیس ہزار....'' کمال کی آواز لڑکھڑا گئی۔

''ہاں آفندی۔ جلدی کرو۔ خوب سمجھ لو۔''

''میں دراصل لکھ رہا ہوں۔ رقم میں لے آؤں گا مگر مجھے یہ تو پتا چلے کہ شیریں اور جلال زندہ ہیں۔ مجھے ثبوت چاہئے۔''

''کیسا ثبوت؟'' سرگوشی کے لہجے میں اب برہمی تھی۔

''کوئی ٹیپ.... کوئی کیسٹ.... ان کی آواز میں کوئی پیغام۔'' کمال کو لگا کہ دوسری طرف سے گھٹی گھٹی آواز میں ہنسی سنائی دی ہے ''یہ ضروری ہے۔''

''کیسٹ تمہیں مل جائے گا۔'' اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔

''ٹھہرو.... میری بات سنو۔'' کمال چلایا مگر اب ڈائل ٹون کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ اس نے مایوسی سے ریسیور لٹکا دیا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ سیدھے یزدانی ہاؤس گئے۔ کمال ڈرائیو وے میں اتر گیا۔ اندر جانے سے پہلے فیروز اس سے بات کرنا چاہتا تھا ''کیا کہا اس نے؟''

کمال نے ہدایات پڑھ کر سنا دیں۔ اسے یہ سب کچھ بے حد غیر حقیقی لگ رہا تھا۔

''اور آواز؟''

''وہ آواز بدل کر بول رہا تھا۔ نیچی اور بھرائی ہوئی آواز میں۔ میرے خیال میں

اس آواز کو کوئی نہیں پہچان سکتا۔ کیسٹ فراہم کرنے کا اس نے وعدہ کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں ابھی زندہ ہیں۔"

"اور یہ تاوان کی رقم؟ تم اتنی بڑی رقم کا آج ہی بندوبست کر سکتے ہو؟"

"کر سکتا ہوں.... جلال کی ماں کی مہربانی سے۔"

"جلال کی ماں؟"

"ہاں۔ نازنین کی دادی کے ترکے میں تین لاکھ تومان ملے تھے۔ وہ میں نے جلال کی تعلیم کے لئے ٹرسٹ فنڈ میں جمع کرا دیئے تھے۔ پچھلے ہفتے بینک سے گوشوارہ آیا تھا۔ اب وہ رقم 3,28,570 تومان ہو چکی ہے۔"

فیروز ہمدانی یہ سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ٹھیک 3,28,000 تومان۔ یہ اتفاق تو نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر تاوان راؤنڈ فیگر میں طلب کیا جاتا ہے "آقائے آفندی' کتنے لوگ ہیں جو اس ٹرسٹ اکاؤنٹ سے واقف ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میرے وکیل اور اکاؤنٹنٹ کے سوا کوئی بھی نہیں۔"

"اور خاتون شیریں پاشا؟"

"مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے شیریں کو اس کے بارے میں بتایا ہو۔"

فیروز ہمدانی یزدانی ہاؤس کے پورچ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ "آقائے آفندی' خوب اچھی طرح یاد کریں کہ اس اکاؤنٹ کے بارے میں کس کس کو معلوم ہے۔" اس نے کمال سے کہا "ہمارے سامنے دو ہی امکان ہیں۔ ایک یہ رقم اور دوسرا یہ کہ شاید مادام یزدانی وہ آواز پہچان لیں۔"

انہوں نے گھنٹی بجائی۔ خالد یزدانی نے دروازہ کھولا۔ "آیئے .... اندر آ جایئے۔" اس نے کہا "ڈاکٹر ابھی گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دل کی تکلیف بڑھ رہی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے آقائے یزدانی لیکن میں انہیں اغوا کرنے والے کی پہلی کال کی ریکارڈنگ سنوانا چاہتا ہوں۔"

خاصی دیر خاموشی رہی پھر خالد نے کمال سے کہا "نسرین نے اسپتال جانے سے انکار کر دیا کہ ضرورت کے اس وقت میں وہ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ ڈاکٹر نے اسے ٹرینکولائزر دی ہے۔ اگر کچھ دیر سونے کا موقع مل جائے...."

اسی وقت اطلاعی گھنٹی بجی "اوہ.... یہ ہماری نئی ہاؤس کیپر ہو گی۔" خالد یزدانی نے کہا۔

"میرا تعارف ڈاکٹر کی حیثیت سے کرائیں۔" فیروز نے جلدی سے کہا "اور ہمارے جانے کے بعد اسے گھر بھیج دیں۔ کہئے گا کہ آپ دو ایک دن میں اسے کال کریں گے۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ اس کی چھان بین کرا لوں۔"

"ٹھیک ہے۔" خالد نے کہا اور جا کر دروازہ کھولا پھر وہ کمرے میں آیا تو اس کے ساتھ عائشہ تھی "میں نے عائشہ کو بتا دیا ہے کہ نسرین کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔" اس نے کہا "عائشہ' یہ سب میرے پڑوسی ہیں کمال آفندی اور یہ ہیں ڈاکٹر ہمدانی۔"

"آپ کیسے ہیں؟" عائشہ نے قدرے شرمیلے پن سے کہا لیکن اس کے لہجے میں گرم جوشی تھی "آقائے آفندی' آپ شاید سامنے سڑک پار رہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"تو پھر پچھلے ہفتے شاید میں نے آپ کے بیٹے کو دیکھا ہو گا۔ میں نے اسے یہاں کا پتا پوچھا تھا۔ بہت پیارا بچہ ہے۔" عائشہ نے کمال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

لیکن کمال اپنے آنسو چھپانے کے لئے دوسری طرف مڑ گیا۔ "ہاں.... مجھے فخر ہے اپنے بیٹے پر۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

فیروز نے جلدی سے عائشہ کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی نظر عائشہ کی انگلی پر پڑی۔ وہ حجرالقمر کی بہت خوب صورت انگوٹھی پہنے ہوئے تھی۔ اسے حیرت ہوئی.... ایک ہاؤس کیپر اور اتنی قیمتی انگوٹھی! وہ خالد کی طرف مڑا "یہ آپ نے اچھا کیا کہ انہیں رکھ لیا۔ آپ کی اہلیہ گھر کی صفائی کے لئے بہت پریشان رہتی ہیں نا۔"

"اوہ ہاں۔" خالد نے حیرت سے فیروز کو دیکھا۔ کیا وہ عائشہ کو اس اغوا میں ملوث سمجھ رہا ہے۔ ورنہ اپنی ہدایت کے خلاف کیوں جاتا۔

کمال دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ عائشہ شرمندہ ہو گئی۔ شاید اس کے ہاتھ بڑھانے کی وجہ سے اس نے اسے زیادہ ہی آزاد خیال سمجھ لیا تھا.... اور یہ بات اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اس نے جا کر دروازہ بند کر دیا۔

جلال شرمندہ تھا۔ وہ کوئی نٹ کھٹ بچہ نہیں تھا کہ یوں روتا لیکن اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا اور اس کے اندر کوئی چیز تھی جو اسے رہ رہ کر پریشان کر رہی تھی۔ یہ اس دن کی بات تھی' جب ماما کو اس برے آدمی نے تکلیف پہنچائی تھی اور وہ اللہ میاں کے ہاں چلی گئی تھیں۔ اس روز وہ اپنی ٹرین سے کھیل رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے ٹرین سے کھیلنا چھوڑ دیا۔

وہ دن یاد آیا تو اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔ حلق میں ٹھنسے ہوئے کپڑے سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اسے رونا آ رہا تھا۔

"جلال.... ایسا مت کرو۔ خود پر قابو رکھو۔"

اسے شیریں آنٹی کی آواز عجیب سی لگی۔ گھٹی گھٹی۔ شاید ان کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا.... یہ جگہ کون سی ہے.... بھیگی بھیگی سی اور بدبودار۔ جب اس آدمی نے اسے بیگ میں ڈالا تھا' اس کے بعد سے اسے تو کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ اسے تو اس وقت ہوش آیا تھا' جب شیریں آنٹی اسے بیگ سے نکال رہی تھیں۔ تو اسے اس سے پہلے کی کوئی بات کیوں یاد نہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے' جیسے جب ماما گری تھیں تو ہوا تھا۔

وہ اس بارے میں مزید سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ شیریں آنٹی اسے دلاسا دے رہی تھیں۔ "جلال' روؤ مت۔ تم تو بہادر بچے ہو۔"

وہ افسردہ ہو گیا۔ شاید شیریں آنٹی اسے بات بات پر رونے والا بچہ سمجھ رہی ہیں۔ شام کو جب وہ آئیں' وہ اس وقت بھی رو رہا تھا۔ حالانکہ بات بس اتنی تھی کہ ان کے آنے سے پہلے سائرہ آنٹی نے اسے کھلانے کی کوشش کی تھی اور اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ تو سائرہ آنٹی نے کہا تھا "لگتا ہے جلال کہ ہمیں تم کو اپنے ساتھ اصفہان لے جانا ہو گا۔ وہاں تمہیں کھلا کھلا کر خوب موٹا کر دوں گی میں۔"

وہ رویا.... اس لئے رویا کہ ایک بات ثابت ہو گئی۔ وہ یہ کہ بابا جانی نے اگر شیریں آنٹی سے شادی کر لی تو وہ ان کے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ وہ آفاق انکل کے ساتھ اسے اصفہان بھیج دیں گے۔ اب ایسی بات پر وہ نہ روتا تو کیا کرتا!

شیریں آنٹی کہہ رہی تھیں "دھیرے دھیرے سانس لو.... اندر.... اب باہر.... پھر

اندر۔ ناک سے سانس لو۔ تم بہت بہادر بچے ہو۔ سوچو کہ جب تم اپنے دوستوں کو اس کے متعلق بتاؤ گے تو وہ تمہیں کیسا بہادر ہیرو سمجھیں گے۔"

باہر.... اندر.... باہر....شیریں آنٹی کا رخسار اب اس کے رخسار سے ملا ہوا تھا۔ شیریں آنٹی کو اس کا خود سے چپکنا برا نہیں لگ رہا تھا اور یہ برا آدمی انہیں یہاں کیوں لایا ہے؟ وہ اسے پہچان گیا تھا۔ چند ہفتے پہلے اس نے اسے دیکھا تھا۔ جب آفاق انکل اسے وہاں لے گئے تھے' جہاں برا آدمی کام کرتا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ ڈراؤنے خواب دیکھنے لگا تھا۔

اسے پھر پھندا لگنے لگا!

"جلال۔" شیریں آنٹی اب اس کے رخسار سہلا رہی تھیں "تم یہ سوچو کہ جب ہم یہاں سے نکلیں گے تو کیا ہو گا۔ تمہارے بابا جانی ہمیں دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے۔ وہ ہمیں یقیناً کہیں تفریح کے لئے لے کر جائیں گے۔ مجھے تمہارے ساتھ آئس اسکیٹنگ کرنا بہت اچھا لگے گا۔ پچھلی بار تم ہمارے ساتھ نہیں آئے۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ آتے تو فائدے میں رہتے۔ میں نے سوچا تھا کہ اسکیٹنگ کے بعد تمہیں چڑیا گھر دکھانے لے جاؤں گی۔"

وہ سنتا رہا۔ شیریں آنٹی کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہیں اور وہ تو خود ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر اس کے دوست خرم نے کہا تھا کہ شیریں آنٹی کو اس کا جانا اچھا نہیں لگے گا۔ وہ کباب میں ہڈی بن جائے گا اور شیریں آنٹی صرف اس کے بابا کو خوش کرنے کے لئے اوپری دل سے اسے ساتھ چلنے کو کہہ رہی ہیں۔

"تمہارے بابا جانی تمہیں فٹ بال کے میچ دکھانے لے جائیں گے۔ انہیں تم پر فخر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تم پر دمے کا اٹیک ہوتا ہے تو تم بڑی بہادری سے اس کا مقابلہ کرتے ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ تم نہ شکایت کرتے اور نہ روتے ہو۔"

شیریں کہتے کہتے رکی اور تھوک نگلنے کی کوشش کی۔ اس طرح منہ بند ہو تو بولنا کتنا دشوار ہوتا ہے "جلال... پتا ہے' جب مجھے کوئی خوف ہوتا ہے یا پریشانی تو میں کیا کرتی ہوں۔ میں وہ کام کرنے کا سوچتی ہوں' جو مجھے سب سے اچھا لگتا ہو' جس میں مجھے سب سے زیادہ لطف آتا ہو۔ میرا خیال ہے' تمہیں اور مجھے ایسا ہی سوچنا چاہئے۔

کوئی ایسا پروگرام بنائیں' جس سے تم خوش ہو جاؤ۔ تمہیں پتا ہے کہ آفاق اور سائرہ اصفہان جانے والے ہیں۔"

جلال کو ایسا لگا کہ کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہے۔

"آرام سے جلال.... دھیرے دھیرے سانس لو۔ ہاں.... میں نے جب آفاق اور سائرہ کا کمرا دیکھا تو کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے میرا جی خوش ہو گیا۔ اتنا خوب صورت منظر نظر آتا ہے وہاں سے کہ جیسے کوئی پینٹنگ ہو۔ وہاں سے جھیل اتنی خوب صورت لگتی ہے کہ اسے دیکھتے ہوئے سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ان کے اصفہان جاتے ہی پہلی فرصت میں اس کمرے پر قبضہ کر لیتی۔ وہاں تم اپنا بک کیس اور کھلونوں کے شیلف بھی رکھ سکتے ہو اور لکھنے کی میز بھی۔ وہ کمرا اتنا بڑا ہے کہ تم وہاں اپنی ٹرینوں کے ٹریک بھی سیٹ کر سکتے ہو۔ تمہیں پتا ہے' میں جب چھوٹی تھی تو میرے پاس بھی ٹرینیں تھیں۔ میرے پاس اب بھی ٹرینیں ہیں۔ وہ میں تمہیں دوں گی۔"

جلال کو خوش گوار حیرت ہوئی۔ تو شیریں آنٹی نہیں چاہتیں کہ میں ان لوگوں کے ساتھ اصفہان جاؤں اور وہ ان کا خوب صورت کمرا مجھے دلوانا چاہتی ہیں!

"اس وقت میں خوف زدہ ہوں اور تکلیف میں بھی ہوں مگر مجھے خوشی ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔ میں تمہارے بابا جانی کو بتاؤں گی کہ تم کتنے بہادر ہو اور تم کتنے آہستہ آہستہ سانس لے رہے تھے۔ تاکہ تمہیں پھندا نہ لگنے پائے۔"

جلال کے دل کو بھینچنے والی مٹھی کی گرفت ہلکی ہو گئی۔ اچانک ہی اسے نیند آنے لگی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن وہ انگلیوں سے شیریں کو چھو سکتا تھا۔ اس نے انگلیوں سے اس کی اونی آستین کو پکڑا اور نیند میں کھو گیا۔

شریں اس کی سانسوں کی کھڑکھڑاہٹ سن کر پریشان ہوتی رہی۔ اس نے ہاتھ سے جلال کے سینے کو چھوا۔ زیر و بم سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دشواری سے سانس لے رہا ہے اور یہ کمرا بے حد ٹھنڈا' بے حد سیلن زدہ تھا۔ پلنگ چھوٹا ہونے کا فائدہ تھا۔ وہ لپٹ کر لیٹنے پر مجبور تھا۔ یوں ایک دوسرے کو جسم کی گرمی پہنچا سکتے تھے۔

اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ عقاب کو گئے کتنی دیر ہو گئی ہے۔ اس کا

خیال تھا کہ اب بارہ بجے کے بعد کا وقت ہے۔ گویا منگل کا دن شروع ہو چکا ہے اور عقاب نے کہا تھا کہ انہیں بدھ تک یہاں رہنا ہو گا پھر وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی کہ کمال ایک دن میں تین لاکھ اٹھائیس ہزار تومان کا بندوبست کیسے کرے گا.... کہاں سے کرے گا؟"

اور آخر خاص طور پر اتنی ہی رقم کیوں؟ یہ بات بھی اسے الجھا رہی تھی۔ وہ تین لاکھ مانگتا یا چار لاکھ تو اس میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی مگر یہ ساتھ میں اٹھائیس ہزار کا دم چھلا کیا معنی رکھتا ہے۔ اور اس نے انہیں ہی کیوں اغوا کیا؟ تاوان کے لئے بے حد دولت مند لوگوں کے بچوں کو اغوا کیا جاتا ہے کروڑپتی' ارب پتی لوگوں کے بچوں کو! کمال آفندی کسی اعتبار سے بھی ایسا دولت مند نہیں تھا اور شیریں کو احساس تھا کہ عقاب' جلال کو عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے وہ اس سے نفرت بھی کرتا ہو اور اس سے خوف زدہ بھی ہو لیکن ایسا خطرناک آدمی ایک چھوٹے سے بچے سے کیوں خوف زدہ ہو گا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

اور اس نے جلال کی آنکھوں کی پٹی کیوں نہیں کھولی' اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ کیا اسے یہ ڈر لگتا ہے کہ جلال اسے پہچان لے گا تو پھر اس کا تعلق سمنان سے ہی ہو گا۔ اسے یاد آیا' جب عقاب گھر میں گھسا تھا تو جلال اسے گھورتا رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ جلال اسے ایک بار اور دیکھے تو شاید اب کے اسے پہچان ہی لے گا۔ شاید عقاب کا خیال بھی یہی ہے۔

اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ کیا عقاب تاوان کی رقم ملتے ہی جلال کو ختم کر دے گا...؟ اپنے لئے اسے خطرہ سمجھ کر! اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ اس کے دماغ نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا تھا۔ اس پر خوف بھی طاری ہوا اور اسے غصہ بھی آیا اور یہ جذبے اتنے شدید اور بے اختیار تھے کہ اس نے غیر ارادی طور پر جلال کو سختی سے لپٹا لیا پھر اسے خاتون مہ وش کا خیال آ گیا۔ ان کا اکلوتا بیٹا ہر لمحے موت سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے وہ بھی ایسے ہی محسوس کر رہی ہوں گی؟ نہیں اس سے بھی زیادہ۔ جلال اس کا بیٹا نہیں پھر بھی اس کو لاحق خطرہ اسے پریشان کر رہا ہے۔ انسان اپنے بچوں کے تحفظ کے لئے کتنا پریشان ہوتا

ہے۔ کمال بھی جلال کے لئے پاگل ہو رہا ہو گا۔ اس وقت خاتون مہ وش اور کمال آفندی' دونوں ایک جیسی اذیت سے دوچار ہوں گے۔

وہ کلائیوں کی بندشوں کو کنکریٹ کی دیوار سے رگڑنے لگی لیکن ڈوری اس سختی سے بندھی تھی کہ اس کے ہاتھوں کو رگڑ زیادہ لگ رہی تھی.... رسی کو کم۔

اس کی نظر دیوار سے چسپاں تصویروں پر پڑی۔ وہ ان عورتوں کو قتل کر چکا ہے۔ کوئی پاگل دیوانہ ہی ایسا کر سکتا ہے کہ جنہیں قتل کرے ان کی تصویریں بھی کھینچے اور اس نے کار میں اس کی تصویر بھی کھینچی تھی۔

اور یہ بم....! اگر کوئی اس طرف آیا اور اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ بم پھٹ جائے گا وہ اور جلال تو مریں گے ہی اور نجانے کتنے لوگ بھی شاید مریں گے۔ یہ خیال آتے ہی وہ مجسم دعا بن گئی۔ 'خدایا.... کمال کو اس وقت سے پہلے ہی ہم تک پہنچا دے۔'

اس کے ہاتھوں اور پیروں میں ہونے والا درد غائب ہو گیا تھا کیونکہ ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے۔ جلال بہت بے چین اور اتھلی نیند سو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ صبح ہونے والی ہے۔ ٹرینوں کے آنے جانے کی آوازیں بڑھ رہی تھیں۔

جلال کسمسایا اور کچھ منمنایا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن کھولی نہیں گئیں۔ اس کی ٹانگیں اور بازو دکھ رہے تھے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ٹرین کی آواز نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔

اسے اپنی کھلونا ٹرین کی آواز یاد آئی.... اور پھر ماما یاد آئیں وہ بھاگ کر نیچے گیا تھا۔ اس کی آواز سن کر اس آدمی نے ماما کو چھوڑ دیا تھا اور ماما گر پڑی تھیں۔ وہ آدمی اس کی طرف گھوما تھا اور پھر وہ آدمی ماما پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے پسینہ بہہ رہا تھا اور وہ بہت خوف زدہ لگ رہا تھا۔

نہیں۔ جس آدمی نے کل دروازہ دھکیلا تھا اور وہ گر گیا تھا اور جو اسے نظریں جھکا کے گھورتا رہا تھا۔ وہ ایسا پہلے بھی کر چکا تھا۔ وہ جھپٹ کر اس کی طرف آیا تھا۔ ہاں.... ماما کے گر جانے کے بعد وہ اس کی طرف جھپٹا تھا۔ اس نے اس کی طرف ہاتھ

بڑھایا تھا اور نظریں جھکا کے اسے گھورا تھا مگر پھر کچھ ہو گیا تھا....

وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہاں.... بیل بجی تھی اور بیل کی آواز سن کر وہ آدمی بھاگ گیا تھا۔ جلال اسے بھاگتے دیکھتا رہا تھا۔

ہاں.... یہی بات تھی' جبھی تو وہ ہر روز اس دن کا خواب دیکھتا تھا.... اس لئے کہ ایک حصہ وہ بھول گیا تھا۔ شاید خوف کی وجہ سے.... وہ ڈراؤنا حصہ' جس میں برا آدمی اس کی طرف آیا تھا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا.... اسے مارنے کے لئے۔

برا آدمی.... وہ آدمی جو آفاق انکل سے بات کر رہا تھا.... وہ وہی تھا' جو کل رات گھر آیا تھا.... جس نے اسے گرایا تھا اور اسے گھورتا رہا تھا۔ یہ وہی آدمی ہے....

"شیریں آنٹی" جلال نے گھٹی گھٹی آواز میں بمشکل پکارا۔

"ہاں جلال.... میں یہیں ہوں تمہارے پاس۔"

"آنٹی.... وہ آدمی.... وہ برا آدمی.... جس نے ہمیں باندھ رکھا ہے...."

"ہاں بیٹے۔ ڈرو مت۔ میں تمہارا خیال رکھوں گی۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔"

"آنٹی۔ آنٹی.... یہ وہی آدمی ہے جس نے میری ماما کو مارا تھا...."

شیریں کو ایسا لگا کہ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔

○

سرخاب اپنے کمرے میں پہنچنے کے لئے بے تاب تھی۔ بس اسے وہاں جانا تھا۔ وہاں کتنی ہی ٹھنڈک ہو۔ وہ اسے مس کر رہی تھی۔ اس کا خواب دیکھنے کا ٹھکانا تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر اس سے دور خوش نہیں رہ سکتی تھی۔

سرخاب کے لئے خوابوں کی بہت اہمیت تھی۔ اس کے پاس خوابوں کے سوا تھا ہی کیا۔ برسوں پہلے جب وہ سو کر اٹھتی تھی تو خود کو ایک غیر شادی شدہ بڈھی اسکول ٹیچر کی بجائے بہت بڑی اور خوب صورت فلم اسٹار سمجھتی تھی۔ وہ تصور کرتی تھی کہ وہ مقبول ترین فلمی اداکارہ ہے جو سینٹرل اسٹیشن آ رہی ہے اور تمام فوٹو گرافرز اس کے منتظر ہیں۔ وہ بہت خوبصورت لباس پہنے ہوئے ہے اور لوگ اس پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔

اس کے ان خوابوں میں تنوع ہوتا تھا۔ مقامات' لباس' سچویشنز اور لوگ بدلتے رہتے تھے پھر یوں ہوا کہ ان خوابوں کے رنگ پھیکے پڑتے گئے... اور اس نے اپنی تنہا بیزار کن زندگی کو ایک تلخ حقیقت کے طور پر قبول کر لیا لیکن جب وہ ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں اسٹیشن پر ہی رہنے لگی تو اسے وہ خواب یاد آئے۔ اب وہ اس کے لئے خواب نہیں تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ ماضی میں سچ مچ اسٹار رہی ہے اور یہ کمرا ملنے کے بعد وہ جب بھی یہاں سوتی تو خواب ضرور دیکھتی..... اپنے خوبصورت ماضی کا خواب۔

منگل کی صبح ساڑھے آٹھ بجے اپنے شاپنگ بیگ لئے وہ کمرے کی طرف چل دی۔ آٹھ بج کر پچاس منٹ پر زاہدان کے لئے گاڑی روانہ ہوتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ مسافروں کے ہجوم میں گھل مل کر نیچے پہنچ جائے گی۔ راستے میں اس نے ایک اسٹال پر رک کر ناشتا کیا۔ اس موسم میں کافی بہت ضروری تھی۔ اسے یوں بھی سردی بہت لگتی تھی۔

ناشتا کر کے وہ بڑھی۔ اپنے آگے چلنے والا شخص اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ اچانک

اسے احساس ہوا کہ یہ تو وہی شخص ہے' جس نے اس کا رات کو اپنے کمرے میں جانے کا پروگرام خراب کر دیا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ رات کو اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی اور ہاتھ میں بیگ تھا جب کہ اس وقت وہ اکیلا تھا اور خالی ہاتھ تھا۔

پھر بھی وہ اس سے ڈر اور ٹھٹک گئی۔ وہ شخص ایک اسٹال پر رکا' اس نے وہاں سے دودھ کے دو پیکٹ' چند رول اور کافی کے دو مگ لئے پھر وہ اسی طرف چل دیا۔

سرخاب کے پاس ابھی کچھ مہلت تھی۔ اس نے چند منٹ ادھر ادھر گزارے اور پھر مسافروں کے ہجوم کے ساتھ نچلے لیول پر زاہدان جانے والی ٹرین کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ لوگ ٹرین میں بیٹھ رہے تھے۔ سرخاب آخری بوگی تک پہنچی۔ ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کرنے کے بعد داہنی جانب مڑ گئی۔

مڑتے ہی اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ اسے پھر وہی شخص نظر آیا۔ دودھ کے ڈبے اور رول شاید اس کے کوٹ کی جیب میں تھے۔ ہاتھوں میں کافی کے مگ لئے وہ پھسلواں راستے پر چلتا ہوا ٹرمینل کی گہرائی میں چلا جا رہا تھا۔

سرخاب جانتی تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہاں اور کچھ تھا ہی نہیں... اس کے خوابوں کے کمرے کے سوا۔ پتا نہیں کیسے' بہرحال اس نے وہ کمرا دریافت کر لیا ہے اسی لئے وہ کل رات بھی بے وقت پلیٹ فارم پر جا رہا تھا۔

غم و غصے سے سرخاب کا برا حال ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ یہ شخص اور اس کے ساتھ لڑکی.... وہ اس کے کمرے پر قابض ہو گئے ہیں۔ اس کے خوابوں کا کمرا!

مگر اس طرح کے لوگوں میں جہد بقا بہت توانا ہوتی ہے۔ نہ ہو تو وہ جئیں کیسے۔

سرخاب نے سر جھٹکا اور بڑی مضبوطی اور یقین سے سوچا کہ کوئی بات نہیں۔ وہ ان سے چھٹکارا پا لے گی۔ وہ اس شخص پر نظر رکھے گی اور جب یہ کہیں جائے گا تو وہ کمرے میں جا کر لڑکی کو ڈرائے دھمکائے گی کہ پولیس کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ یہاں رہ رہے ہیں اور یہ جرم ہے اور عنقریب پولیس انہیں گرفتار کرنے کے لئے آ رہی ہے۔ وہ اسے اتنا ڈرائے گی کہ وہ مرد کو کمرا چھوڑنے پر مجبور کر دے گی۔

سرخاب ویٹنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس کمرے سے دل نہ لگانا حسینہ۔ اس نے تصور میں کمرے میں قابض لڑکی کو لتاڑا۔ ورنہ تمہارا دل ٹوٹ جائے گا۔ نکل لو تو

بہتر ہے۔

○

کمال' فیروز' آفاق اور فیروز کا ماتحت ناصر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ فیروز کے سامنے ایک فہرست تھی اور وہ اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ "پہلی بات یہ کہ میرا ایک آدمی یہ معاملہ نمٹنے تک چوبیس گھنٹے یہاں موجود رہے گا۔ یہ عقاب اتنا چالاک ہے کہ اب یہاں فون کرے گا' نہ ہی یزدانی ہاؤس لیکن پھر بھی کبھی کبھی خلاف امکان بھی ہو جاتا ہے۔"

فیروز کے ماتحت ناصر نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"ابھی آقائے آفندی کو تہران جانا ہے۔" فیروز ہمدانی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "فون کی گھنٹی بجے تو خاتون سائرہ آپ ریسیو کریں گی۔ ایکس ٹنشن پر ناصر ہو گا۔ کال ریکارڈ بھی ہو گی۔" سائرہ کی طرف مڑا "اگر اغوا کرنے والے کا فون ہو تو اسے باتوں میں الجھانے کی کوشش کرنا۔ کال جتنی طویل ہو' اتنا ہی اچھا ہے۔"

"میں کوشش کروں گی۔"

"اور جلال کے اسکول کا کیا ہو گا۔ آپ نے انہیں اس کی بیماری کی اطلاع دی؟" فیروز نے سائرہ سے پوچھا۔

"ہاں.... آپ کی ہدایت کے مطابق.... ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے۔"

"گڈ" فیروز' کمال کی طرف مڑا۔ "آپ نے اپنے آفس سے رابطہ کیا۔"

"ہاں۔ یہ تجویز میرے پبلشر ہی کی تھی۔ میں نے فون کر کے بتا دیا کہ میں جلال کو لے کر کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔"

اب فیروز' آفاق سے مخاطب ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پورے دن گھر میں رہو۔ یہ بات کسی کو غیر معمولی تو نہیں لگے گی؟"

سائرہ بڑی بے رحمی سے ہنسی۔ "بس شراب خانے والوں کو محسوس ہو گی۔"

"بس ٹھیک ہے۔ آپ دونوں جائیں۔" فیروز نے آفاق اور سائرہ سے کہا۔

وہ دونوں کچن میں چلے گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے دروازہ بند کیا تھا لیکن دروازہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔

فیروز نے دروازے کو دھکیلا۔ وہ زور دار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ "میرے خیال میں یہ دونوں گھر میں ہونے والی ہر بات سے باخبر رہتے ہوں گے۔" اس نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" کمال نے کندھے جھٹکے۔

"آپ نے بتایا تھا کہ یہ دو سال سے یہاں رہ رہے ہیں۔"

"دو سال سے کچھ اوپر ہو گئے۔ سائرہ ہماری ہاؤس کیپر تھی۔ نازنین کے قتل کے بعد میرے لئے جلال کی دیکھ بھال کا مسئلہ تھا میں نے سائرہ سے بات کی کہ وہ لوگ یہاں رہ لیں۔"

"کچھ فائدہ بھی ہوا اس سے؟"

"بہت۔ یہ دونوں جلال سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن ایک سال پہلے آفاق ریٹائر ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بہت زیادہ پینے لگا۔ اب یہ لوگ اصفہان جانے والے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے ان کے جانے سے خوشی ہو گی۔ آفاق کی بلا نوشی مجھے پسند نہیں۔"

"تو یہ اب رکے ہوئے کیوں ہیں؟" فیروز نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "پیسوں کی کمی کی وجہ سے؟"

"نہیں میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ شاید میرے خیال سے رکے ہوئے ہیں۔ سائرہ چاہتی ہے کہ میں شادی کر لوں۔ تاکہ جلال کو پھر سے ماں میسر آ جائے' اسے جلال کی بڑی فکر رہتی ہے۔ اب شیریں پاشا سے آپ کی شادی میں کوئی رکاوٹ تو نہیں؟"

کمال کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے انداز سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ برف باری پھر شروع ہو گئی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بھی برف کے ان ذرات کی طرح ہو گیا ہے جنہیں خود پر کوئی اختیار نہیں۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا لیکن یوں کیسے کام چلے گا۔ وہ یہاں بیٹھ کر صرف انتظار تو نہیں کر سکتا۔ اسے کچھ کرنا چاہئے۔ "میں اب تہران جاؤں گا۔" اس نے کہا۔

"ٹھہریں، ہمیں ایک امکان پر غور کرنا ہے۔" فیروز ہمدانی نے جلدی سے کہا "اگر آپ کو جلال اور خاتون شیریں کے پیغام کا کیسٹ نہیں ملا تو کیا ہو گا؟ کیا آپ بغیر ثبوت کے تاوان کی ادائیگی کے لئے تیار ہیں؟"

کمال چند لمحے غور کرتا رہا "ادائیگی تو کرنی پڑے گی۔ میں اسے مشتعل کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" بالآخر اس نے کہا۔ "مگر مجھے یقین ہے کہ وہ کسی محفوظ طریقے سے کیسٹ مجھ تک پہنچا دے گا۔"

"چلیں، ٹھیک ہے۔ رات دو بجے تک کیسٹ نہ ملے تو جب وہ رقم کے لئے فون کرے تو اس کو بتا دیجئے گا کہ کیسٹ آپ کو نہیں ملا ہے اور اگر وہ کہے کہ اس نے کیسٹ بھیجا ہے تو آپ مجھے مطلع کر دیجئے گا۔ میں اس جگہ کو چیک کروں گا۔ ہاں... آپ اسے ادائیگی کریں گے یا میں جعلی نوٹوں کا بندوبست کروں۔ اسے ہم ٹریس کر سکیں گے۔"

"نہیں۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔ وہ رقم جلال کی تعلیم کے نام کی ہے۔ خدانخواستہ جلال کو ہی کچھ ہو گیا تو وہ کس کام کی۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ اپنے بینک سے کیشئیر کا چیک لیں اور رائیل ریزرو بینک چلے جائیں۔ وہ آپ کو ایسے پرانے نوٹ دیں گے جن کی تصویریں ہمارے پاس موجود ہیں۔ اس طرح کم از کم ہمارے پاس ریکارڈ تو رہے گا۔ اب کچھ احتیاطی اقدامات سن لیں، جن پر میں اصرار کروں گا۔ پہلی بات یہ کہ ہم آپ کی کار میں ایک حساس کیمرا نصب کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہمیں مجرم کی تصویر یا اس کی کار کی نمبر پلیٹ کی تصویر مل جائے، ہم آپ کی کار میں بیپر بھی لگانا چاہیں گے۔ اس طرح ہم کچھ فاصلے سے آپ کا تعاقب کر سکیں گے اور نوٹوں کے سوٹ کیس میں بھی ایک الیکٹرونک ٹریسر نصب کیا جائے گا۔"

"اور اگر وہ اسے نظر آ گیا تو وہ سمجھ جائے گا کہ میں نے اس کی ہدایت کی خلاف ورزی کی ہے۔" کمال نے اعتراض کیا۔

"اور اگر فرض کر لیں کہ ہم ٹریسر نہیں رکھتے اور مجرم رقم لے جاتا ہے، اس کے بعد وہ آپ سے رابطہ ہی نہیں کرتا کیونکہ اس کا الو تو سیدھا ہو چکا ہے تو پھر ہمیں اس

کا سراغ کیسے ملے گا۔ ٹریسر کم از کم .... یہ تو بتا سکے گا کہ وہ شہر کے کس حصے میں ہے۔"

کمال نے بے بسی سے کندھے جھٹک دیئے، "تم جو ضروری سمجھتے ہو، وہ کرو۔"

○

کمال نے اپنی گاڑی ریلوے اسٹیشن کے باہر چھوڑ دی۔ تاکہ فیروز اس میں تمام ضروری کارروائیاں کر سکے پھر اس نے 10:40 والی گاڑی پکڑی اور ساڑھے گیارہ بجے تہران پہنچ گیا۔

وہ بینک پہنچ گیا۔ اس اعلان نے کہ وہ چند سو تومان چھوڑ کر مکمل رقم نکلوانا چاہتا ہے، بینک کی انتظامیہ کو سراسیمہ کر دیا۔ بینک کا منیجر لپکا ہوا کمال کے پاس آیا۔ "آقائے آفندی خیریت تو ہے۔"

"جی خیریت ہے۔"

"آپ اتنی بڑی رقم نکلوا رہے ہیں۔ کوئی مسئلہ، کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ رقم نکلوانا میرا حق ہے۔" کمال نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

"بے شک ہے لیکن اتنی بڑی رقم.... خیر، اس کے لئے آپ کو کچھ فارم بھرنے ہوں گے۔"

کمال کو کچھ فارم دیئے گئے، جو اس نے مشینی انداز میں بھر دیئے۔ فارم کیشئیر کو دے دیئے گئے، جسے چیک بنانا تھا۔ مستند چیک۔

منیجر اب بھی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ "آپ اسے مداخلت نہ سمجھیں آقائے آفندی لیکن میں بے حد خلوص سے کہہ رہا ہوں کہ کوئی مسئلہ درپیش ہو تو ہمیں بتائیں ہم جو کچھ کر سکتے ہیں، ضرور کریں گے۔"

"میں نے کہا نا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اب میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ اس رقم سے کیا کرنے والا ہوں یہ تو کاروباری راز ہے۔"

منیجر خاموش ہو گیا۔ پانچ منٹ بعد کمال کو کیشئرز... چیک مل گیا۔

بینک سے نکل کر کمال نے ٹیکسی روکی اور رائیل ریزرو بینک پہنچا وہاں اسپیشل پولیس والے ان نوٹوں کی تصویریں کھینچنے میں مصروف تھے جو اسے دیئے جانے والے

تھے۔ اس نے اپنے بینک کا کیشئرز چیک وہاں جمع کرا دیا۔

کمال بڑی بے تعلقی سے نوٹوں کو سوٹ کیس میں سلیقے سے جماتے ہوئے دیکھتا رہا۔

وہ بھاری سوٹ کیس لئے ہوئے کمال دوبارہ سینٹرل ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ تین بجے والی ٹرین اس سے مس ہو گئی۔ اب چار بجے ٹرین ملنی تھی۔ اس نے گھر فون کر کے پوچھا لیکن وہاں اس کے لئے کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کا سر بھی طرح دکھ رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے گزشتہ روز دوپہر کو کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک اس نے کچھ نہیں کھایا ہے۔

وہ روشن ریستوران کی طرف چل دیا۔ راستے میں وہ اسی فون بوتھ کے پاس سے گزرا، جہاں سے اس نے بیس گھنٹے پہلے گھر فون کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی نے کال ریسیو نہیں کی تھی مگر اسے یہ برسوں پرانی بات لگ رہی تھی۔ کس قیامت کے بیس گھنٹے تھے وہ!

وہ شیریں اور جلال کے بارے میں سوچنے لگا۔ نجانے وہ کہاں ہوں گے؟ انہیں کچھ کھانے کے لئے بھی دیا گیا ہو گا یا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ شیریں کے جہاں تک بس میں ہوا، وہ جلال کا خیال رکھنے کی کوشش کرے گی۔

اس نے دل بہلانے کے لئے تصور کیا کہ یہ واقعہ رونما نہیں ہوا۔ وہ گھر پہنچا ہے جہاں شیریں اور جلال اس کے منتظر ہیں اور اب جلال سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا ہے۔ اب ان کے پاس ذاتی گفتگو کرنے کا موقع ہے۔ "شیریں.... تم مجھ سے شادی کرو گی؟" وہ پوچھتا ہے۔ "ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہیں گے۔"

شیریں خاموش ہے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا ہے۔

کمال کو شک ہونے لگا کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو شیریں انکار کر دیتی - وہ سزائے موت کے معاملے میں اس کے سخت موقف پر اس سے خفا ہے لیکن وہ کیا کرے وہ پوری سچائی کے ساتھ جو سمجھتا ہے، وہ نہ کہے نہ لکھے تو یہ بددیانتی ہو گی۔

ریستوران تقریباً خالی تھا۔ وہ ایک میز پر جا بیٹھا اور کھانے کا آرڈر دیا۔ سوٹ کیس کو اس نے اپنے پیروں کے پاس رکھ لیا۔

پچھلے مہینے اس نے شیریں کے ساتھ یہاں لنچ کیا تھا۔ شیریں بہت خوش تھی کیونکہ سزائے موت کے خلاف جو یہ مہم چلا رہی تھی، اس میں بڑے لوگ بڑی تعداد میں شامل ہو رہے تھے۔ اسے پورا یقین تھا کہ جواد اصغر کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کردیا جائے گا اور شاید کمال نے اس وقت اس سے کہا تھا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں شیریں۔"

وہ بیٹھا رہا۔ کھانا اس کے سامنے رکھے رکھے ٹھنڈا ہو گیا، اس نے کھانے کو چھوا بھی نہیں۔ چار بجنے میں پانچ منٹ پر وہ اٹھا، اس نے بل ادا کیا اور پلیٹ فارم پر روانگی کے لئے تیار کھڑی ٹرین کی طرف چل دیا۔

وہ آخری بوگی میں چڑھا تھا۔ اس نے اس شخص کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا، جو بڑے انہماک سے شام کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ اس شخص کے پاس سے گزر گیا تو اس شخص نے اپنے چہرے کے سامنے سے اخبار ہٹایا اور چمکتی آنکھوں سے اس سوٹ کیس کو گھورنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد طمانیت خیز مسکراہٹ ابھری۔

وہ مسافر سمنان کے اسٹیشن پر بھی اس کے ساتھ ہی اترا لیکن وہ پلیٹ فارم پر ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ کمال پارکنگ لاٹ میں پہنچ گیا۔ کمال اپنی گاڑی میں بیٹھ کر پارکنگ لاٹ سے نکلا تو وہ حرکت میں آیا۔

کمال کو یقین تھا کہ اب تک فیروز ہمدانی کے ماتحت اس کی کار کے ساتھ ضروری کارروائی کر چکے ہوں گے۔ ہیڈ لائٹس اور عقب نما آئینے کے پیچھے بے حد طاقت ور اور حساس کیمرے چھپا دیئے ہوں گے۔

○

نسرین یزدانی ایک بجے تک سوتی رہی۔ رات کو اس کی دل کی تکلیف بڑھ گئی تھی لیکن اسپتال جانا اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہاں اسے بے خبر کر دینے والی دوائیں دی جائیں گی اور وہ بے کار ہو کر رہ جائے گی۔ وہ یہ بات نہیں بھول سکتی تھی کہ اس کی گواہی نے جواد اصغر کو پھانسی کی تختے تک پہنچایا ہے۔

"اس نے آپ کو گرایا تھا خاتون یزدانی؟" وکیل نے پوچھا تھا۔

"جی ہاں۔ وہ آفندی کے گھر سے نکلا تھا اور اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔"

"اندھیرا کافی تھا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ سے پہچاننے میں غلطی ہوئی ہو۔"

"نہیں' کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ وہ دروازے کے باہر کچھ ہچکچایا تھا پھر وہ بھاگا تو مجھ سے ٹکرایا اور کچن کی لائٹ آن تھی۔"

وہ اس خیال سے چونک کر باہر نکلی۔ بے چارہ کمال! اب ذرا زندگی سے سمجھوتا کر رہا تھا تو یہ واقعہ پیش آ گیا۔ اب جلال اور شیریں اغوا ہو گئے۔ ایک گھر پر دو بار مصیبت.... وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ عقاب! اغوا کرنے والے نے جس انداز میں یہ لفظ ادا کیا تھا اسے کچھ یاد آتے آتے رہ جاتا تھا.... وہ لہجہ.... وہ آواز.... اس سے کسی کا خیال آتا تھا۔

دروازہ کھلا اور خالد نے اندر جھانکا۔ "آ جاؤ ڈیئر۔ میں جاگ چکی ہوں۔ ہاں.... کمال نے اس سے فون پر بات کی؟"

خالد نے اسے اختصار کے ساتھ سب کچھ بتایا۔ "مختصر سی گفتگو ریکارڈ ہوئی ہے۔ یہ ہمدانی بہت تیز آدمی ہے۔ مجرم کی چالاکی کے باوجود گفتگو ریکارڈ کر لی۔ اب تم چاہو تو سن سکتی ہو۔"

"ہاں۔ ضرور سنوں گی۔"

پندرہ منٹ بعد فیروز ہمدانی کمرے میں آیا۔ اس نے کیسٹ پلیئر میں لگایا اور پلے کا بٹن دبا دیا۔

نسرین توجہ سے سنتی رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بہت دھیمی آواز ہے۔ اسے سن کر کچھ کہنا بہت مشکل...."

فیروز کے چہرے پر ایک لمحے کو مایوسی نظر آئی پھر اس نے کہا۔ "بہت شکریہ خاتون یزدانی۔" اس نے کیسٹ باہر نکال لیا۔

"رکو.... ایک منٹ" نسرین نے کہا۔ "یہ تم میرے پاس نہیں چھوڑ سکتے؟ مجھے یقین ہے کہ رات کو جس شخص نے فون کیا تھا' میں اسے جانتی ہوں۔ اب میں اپنے پچھلے ہفتوں کی ہر بات یاد کرنے کی کوشش کروں گی۔ ممکن ہے کوئی کام کی بات یاد آ جائے۔"

"کاش.... ایسا ہو سکے خاتون...." فیروز نے کہا۔ خالد یزدانی کی تنبیہی نظروں کو

دیکھتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی پھر وہ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا اور خالد یزدانی اس کے پیچھے تھا۔

وہ نیچے پہنچے تو خالد نے کہا۔ "ایک بات بتاؤ۔ آج تم نے عائشہ کے بارے میں ارادہ کیوں بدل دیا۔ پہلے تو تم نے کہا تھا کہ میں اسے ٹال دوں۔"

"دیکھئے.... بظاہر وہ ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔ لیکن ہم کوئی امکان نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میں نے چھان بین کرائی ہے۔ وہ اچھی فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے اس کی اور اس کے شوہر کی تعریف کی ہے۔ جس وقت یہ واقعہ ہوا' وہ سینما میں فلم دیکھ رہی تھی پھر بھی اب ہمارے پاس کوئی ٹھوس کلیو تو ہے نہیں۔"

"اس نے بتایا ہے کہ اس شام اس کی کار چوری ہو گئی تھی۔ خوش قسمتی ہے کہ اتنی آسانی سے مل گئی۔"

"جی ہاں۔ سات بجے اس نے اور اس کے شوہر نے کار چوری ہونے کی رپورٹ درج کرائی تھی۔" فیروز نے کہا "آقائے یزدانی معاملہ کچھ مشکوک سا لگتا ہے۔ ادھر آفاق اور.... سائرہ معاشی پریشانیوں سے دوچار ہیں۔ ممکن ہے انہیں ٹرسٹ اکاؤنٹ کے بارے میں معلوم ہو گیا ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

خالد نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں۔ وہ بے حد ایمان دار لوگ ہیں۔ نسرین بھی ان سے کچھ منگوائے تو یہ ایک ایک پیسے کا حساب دیتے ہیں۔ دونوں میاں بیوی ایسے ہی ہیں۔ ان پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"اچھا آقائے یزدانی' میں آفندی کے ہاں ہوں۔ اگر خاتون نسرین کو کچھ بتانا ہو تو مجھے وہاں فون کر دیں۔"

فیروز ہمدانی' کمال کے گھر پہنچا۔ وہاں اس کا ماتحت ناصر ایک خبر لئے اس کا منتظر تھا۔ گزشتہ رات خاتون مہ وش نے شیریں پاشا سے بات کی تھی۔" اس نے بتایا۔

"کیا.... کہہ رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ یہ بات جواد اصغر نے بتائی ہے۔ میں نے اپنے کچھ آدمیوں کو اس سے انٹرویو کے لئے بھیجا تھا۔ انہوں نے اسے اس اغوا کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ آقائے آفندی کو ان کے بیٹے کے حوالے سے دھمکیاں مل رہی ہیں۔

انہوں نے اسے خبردار کیا کہ اس کے دوست اس طرح کی کوشش کر سکتے ہیں لہٰذا وہ اپنے دوستوں کے نام بتا دے۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"اس کے ہاتھ صاف ہیں۔" ناصر نے کہا۔ "پچھلے ایک سال میں جیل میں اس سے ملنے کے لئے اس کی ماں کے سوا کوئی نہیں آیا۔ اس کے دوست کالج میں ہیں اور تقریباً سبھی تہران میں ہوسٹل میں رہ رہے ہیں۔ بہرحال اس نے بتایا کہ شیریں نے اس کی ماں کو فون کیا تھا۔"

"پھر اس کی ماں سے بھی پوچھ گچھ کی گئی؟"

"جی ہاں۔ وہ گھر پر نہیں تھی۔ علی میاں کی درگاہ پر دعا کر رہی تھی۔ وہ نہیں مانتی کہ اس کے بیٹے کو پھانسی ہو جائے گی۔ خدا اس پر رحم کرے۔ بہرحال' اس نے بتایا کہ شیریں نے اسے چھ بجنے میں چند منٹ پر فون کیا تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ شیریں پر پھٹ پڑی۔ اسے دھمکی دی کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے اگر اس کے بیٹے کو سزا ہوئی تو وہ اس کا ذمے دار شیریں کو ہی سمجھتی ہے۔ اب اس سے آپ کیا نتیجہ نکالتے ہیں؟"

"میں تو مفروضے ہی قائم کر سکتا ہوں۔ فرض کر لو کہ شیریں پاشا کو اس گفتگو نے اپ سیٹ کر دیا۔ اس نے اپنے کسی معتمد دوست کو فون کیا اور اغوا برائے تاوان کا یہ ڈراما تیار کیا اور اب یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ جواد اصغر کی سزائے موت معاف کی جائے' ورنہ ننھے جلال آفندی کی جان لے لی جائے گی۔"

"یہ ایسا ناممکن بھی ہیں۔" ناصر نے تبصرہ کیا۔

فیروز ہمدانی کے چہرے پر سختی چھا گئی۔ "میرے خیال میں تو یہ بہت مضبوط امکان ہے۔ بے چارے آفندی پر صرف اسی لئے قیامت گزر رہی ہے کہ شیریں پاشا اپنی مرضی کا انصاف لینا چاہتی ہے اور اس کے لئے کوشش کر رہی ہے۔"

"ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"ہم تو اسے اغوا برائے تاوان کی ایک سنجیدہ واردات کے طور پر لیں گے۔ ہمیں شیریں پاشا کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کو چیک کرنا ہو گا اور دعا کرو کہ خاتون یزدانی کو یاد آ جائے کہ وہ کس کی آواز ہے۔"

○

نسرین یزدانی اپنے کمرے میں وہ کیسٹ بار بار چلا کر سن رہی تھی۔ ہر بار وہ بے بسی سے نفی میں سر ہلاتی اور اسٹاپ کا بٹن دبا دیتی۔ اس نے سوچا کہ اس طرح بات نہیں بنے گی۔ اسے پچھلے چند ہفتوں کی ہر بات یاد کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ وہ کوئی بہت لوگوں سے تو ملتی نہیں تھی کہ یاد کرنے میں دشواری ہو۔ اس کی بیماری نے اس کی سوشل لائف کو بے حد محدود کر رکھا تھا۔

پچھلے روز وہ گھر سے نکلی ہی نہیں تھی۔ نکلی تھی تو اس عقاب کے فون کرنے کے بعد ہی نکلی تھی۔ اتوار کو وہ خالد کے ساتھ تہران ایک رشتے دار سے ملنے کے لئے گئی تھی۔ اتوار کو وہ ہیئر ڈریسر کے پاس گئی تھی۔ اس روز وہ ڈاکٹر کے پاس بھی گئی تھی۔

غیر ارادی طور پر اس نے کیسٹ پلیئر کا پلے کا بٹن دبایا اور اسے سننے لگی۔ وہی بھنچی بھنچی' دھیمی آواز.... "آفندی.... پانچ منٹ کے اندر بوتھ نمبر 24 میں پہنچو۔ وہاں بات ہو گی...."

○

فون بوتھ سے نکلتے ہوئے عقاب اس کیسٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا' جو کمال آفندی نے مانگا تھا۔ وہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ وہ شیریں اور بچے کی آواز میں پیغام ریکارڈ کر کے بھجوا دے گا اور پھر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ان دونوں کو ختم کر سکتا ہے۔ کیوں نہیں؟ آواز کبھی اس بات کی ضمانت نہیں ہو سکتی کہ اغوا کئے جانے والے زندہ بھی ہیں۔ بیوقوف کہیں کا۔ عقلمند بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ سیدھا سینٹرل ریلوے اسٹیشن گیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے اسیر بھوکے ہوں گے۔ وہ شیریں کو تو بھوکا رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن امکان یہ تھا کہ شیریں بچے کو کھلائے بغیر کچھ نہیں کھائے گی۔ چلو' اس کی خاطر بچے کو بھی کھلا دیں....

وہ پھر نروس ہونے لگا۔ بچے کا خیال ہی ہمیشہ اسے نروس کر دیتا تھا۔ ابھی چند ہفتے پہلے تو وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔ اسے اچانک احساس ہوا.... اور اس نے دیکھا کہ بچہ کار

کی کھڑکی سے لگا اسے گھور رہا ہے.... بالکل ویسے ہی جیسے اس کے خوابوں میں اسے گھورا کرتا ہے۔ وہی خوبصورت الزام دینے والی آنکھیں۔ اور وہ ڈر گیا تھا.... گھبرا گیا تھا۔

اس نے سوچا' آج سہ پہر وہ سمنان جائے گا۔ جا کر دیکھے گا کہ اس کے لئے کوئی پیغام تو نہیں آیا ہوا ہے پھر یہ بھی سوچنا ہے کہ ان کی آوازوں کا کیسٹ آفندی تک کیسے پہنچایا جائے۔ یہ بات بہرحال اہم تھی۔ عین ممکن تھا کہ آواز سنے بغیر آفندی رقم کی ادائیگی سے انکار کر دے اور یہ نازک معاملہ تھا۔ کیسٹ پہنچانے میں وہ پھنس بھی سکتا تھا۔ اسے کوئی بے حد محفوظ طریقہ سوچنا ہو گا۔

دوسری طرف رقم کی بھی اس کے لئے بہت زیادہ اہمیت تھی۔ اب یہاں ٹھہرنا اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اور ویسے بھی وہ یہ بات اتنے لوگوں سے کہہ چکا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ یہاں سے جانے والا ہے۔

پولیس والے اسی انداز میں تو تفتیش کرتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں۔ اس علاقے میں غیر متوقع طور پر کوئی شخص کہیں اور تو منتقل نہیں ہوا ہے۔

اس کا معاملہ مختلف تھا۔ اس نے تو مہینوں پہلے سے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ جانے والا ہے۔ دکان کے مالک سے اس نے تعلقات دانستہ خراب کر لئے تھے اور اب وہ اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ وہ اس کی دکان خالی کر دے۔ کسی کو اس پر شبہ بھی نہیں ہو گا۔

اچانک اس کی سمجھ میں آ گیا کہ کیسٹ کہاں پہنچایا جائے۔ علی میاں کی درگاہ اس کے لئے بہت مناسب رہے گی۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ اس میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا ٹرمینل میں داخل ہوا' ایک اسٹال پر رک کر اس نے رول' دودھ کے ڈبے اور کافی کے دو مگ لئے۔ وہ شیریں پر یہ تاثر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ کوئی نامہربان اور بے رحم آدمی ہے۔ وہ اس کی زندگی سنوار سکتی تھی۔

وہ نیچے چل دیا۔ ٹریک نمبر32 کے پلیٹ فارم پر چلتے چلتے وہ آخری سرے تک پہنچا۔ اس تمام عرصے میں اسے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ نظروں کے معاملے میں اس کی حس بہت تیز تھی۔ نظروں کی چبھن کا اسے فوراً ہی احساس ہو جاتا

تھا۔

وہ دبے پاؤں واپس چلا۔ اوپر جانے والے زینے پر اسے ایک عورت شاپنگ بیگ لئے جاتی نظر آئی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو بے ٹھکانا ہوتی ہیں اور ریلوے ٹرمینل ہی ان کے لئے گھر کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہ واپس ہوا اور پھسلواں راستے پر چلتا آہنی زینے تک پہنچا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

کمرے کے دروازے پر ٹھہر کر اس نے بڑی احتیاط سے اٹکے ہوئے دھاگے کو علیحدہ کیا۔ وہ بڑا نازک کام تھا ذرا سی غلطی ہوتی تو دھماکا ہوتا اور اندر والے تو مرتے ہی' خود اس کے بھی چیتھڑے اڑ جاتے۔

اس نے لاک کھولا اور کمرے میں داخل ہوا۔ سوئچ دبا کر اس نے روشنی کی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ شیریں اور جلال اسی پوزیشن میں تھے' جس میں وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے ہاتھ کی چیزیں نیچے رکھیں اور شیریں کے منہ سے کپڑا نکالا۔

شیریں بہت نروس لگ رہی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سے خوف زدہ ہو۔ "کیا تم خوفزدہ ہو شیریں۔" اس نے بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔

"نہیں.... بالکل نہیں۔" شیریں نے جلدی سے کہا۔ "مگر میں چاہتی ہوں کہ تم جلال کے منہ سے کپڑا نکال دو اور کیا تم ہمارے ہاتھ نہیں کھول سکتے۔"

عقاب کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ کوئی بات ہے۔ شیریں کا انداز بدلا لگ رہا تھا۔ "کیوں نہیں جانم۔" اس نے بے حد محبت سے کہا پھر اس نے شیریں کے ہاتھ کھول دیئے اور اس کے بعد بچے کے ہاتھ کھولنے لگا۔

بچہ سہم کر شیریں سے لپٹ گیا۔ "ڈرو نہیں جلال' سب ٹھیک ہے۔" شیریں نے اسے چمکارا۔ "یاد ہے' ہم کیا باتیں کر رہے تھے۔"

عقاب فوراً شک میں مبتلا ہو گیا۔ "تم لوگ کیا باتیں کرتے رہے ہو۔ مجھے بھی بتاؤ شیریں۔"

"یہی کہ جلال کے بابا تمہیں رقم ادا کر دیں گے اور تم انہیں بتا دو کہ جلال انہیں کہاں مل سکتا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی

مگر اس سے پہلے ہم جلال کے بابا کو بتا دیں گے کہ جلال یہاں بند ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

عقاب کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ "شیریں تمہیں یقین ہے کہ تم میرے ساتھ چلنا چاہتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل۔ یہ میری خواہش ہے۔ میں تمہیں پسند کرتی ہوں عقاب۔"

"یہ میں بچے کے لئے دودھ' رول اور کافی لایا ہوں۔"

"تمہارا بہت شکریہ۔"

عقاب' شیریں کو جلال کی کلائیاں سہلاتے بغور دیکھتا رہا پھر شیریں کی پیشانی پر سے اس کے بال ہٹائے۔ عقاب نے اس کی طرف کافی کا مگ بڑھایا۔ شیریں نے مگ میں سے کافی کا گھونٹ لیا پھر بولی۔ "جلال کو دودھ دے دو۔"

عقاب نے دودھ کا پیکٹ شیریں کو دیا۔ شیریں نے اسے جلال کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "یہ لو.... آہستہ آہستہ پیو۔"

لڑکے کی تیز چلتی ہوئی سانسیں عقاب کو اضطراب اور غصے میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اس نے مکھن لگے رول شیریں کی طرف بڑھائے۔ شیریں نے ایک رول جلال کو دیا۔ "لو جلاّل' یہ رول ہے کھالو۔"

شیریں کا لہجہ حلاوت اور نرمی سے بھرپور تھا۔ عقاب کو ایسا لگا' جیسے وہ دونوں اس کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہوں۔ عقاب نے اپنا کوٹ نہیں اتارا تھا کیونکہ کمرے میں سردی بہت تھی۔ وہ نارنگیوں کے خالی کریٹ پر ٹک گیا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے اپنا کیسٹ پلیئر نکالا۔ "تمہیں آفندی کے لئے ایک ریکارڈنگ کرنی ہے۔" اس نے شیریں سے کہا۔

"ریکارڈنگ۔" شیریں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سوچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کیا اس موقع سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جب سے اسے یہ پتا چلا تھا کہ یہ شخص کمال کی بیوی نازنین کا قاتل ہے' تب سے وہ اور خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ یہاں سے نکل بھاگنے کے لئے فکر مند تھی۔ وہ یہاں سے نکل جاتی تو جواد اصغر کو بچانے کی کوشش کر سکتی تھی اور اگر آج رات بھی اس قید میں گزر گئے تو بہت دیر ہو جائے گی.... جواد اصغر کے لئے بھی.... اور اس کے لئے بھی۔ اب تو اسے ان کوششوں پر

شرمندگی ہو رہی تھی جو اس نے جواد کی جاں بخشی کے لئے کی تھی اور جواد کی ماں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ اس کے جرم پر مصر رہی تھی۔ اس نے کبھی جواد کو "بے قصور نہیں سمجھا تھا اور نہ کہا تھا اور یہی بات جواد کو سزائے موت کی طرف لے گئی تھی۔ سب سے بڑھ کر وہی جواد کی ابتلا کے ذمے دار تھی۔

عقاب کے پاس ریوالور تھا۔ اس نے اسے ریوالور کوٹ کی جیب میں رکھتے دیکھا تھا۔ اگر عقاب اس سے لپٹے تو اسے ریوالور نکالنے کا موقع مل سکتا ہے اور اگر ریوالور ہاتھ آ جائے تو وہ اسے قتل کر سکتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے' اس نے سر جھکا کر جلال کو دیکھا پھر اسے جواد اصغر کا خیال آیا۔ اس نے جان لیا کہ وہ ہچکچائے بغیر اس شخص کو قتل کر سکتی ہے۔

وہ اسے کیسٹ ریکارڈر میں ڈالتے دیکھتی رہی پھر اس نے اس کی طرف ایک کاغذ بڑھایا "جو اس میں لکھا ہے' وہ ریکارڈ کرا دو" اس نے شیریں سے کہا۔

شیریں نے وہ پیغام پڑھا "ڈیئر کمال۔ اگر تم ہماری بخیر و عافیت واپسی چاہتے ہو تو تاوان کی رقم جمع کرا دو۔ تین لاکھ اٹھائیس ہزار تومان.... بڑے اور چھوٹے نوٹوں کی شکل میں۔ تہران میں دو بجے رات شارع پہلوی کے بوتھ نمبر 59 میں اکیلے پہنچو۔ پولیس کو اطلاع نہ کرنا۔"

شیریں نے سر اٹھا کر عقاب کو دیکھا "میں اس میں کچھ اضافہ کر سکتی ہوں؟" اس نے پوچھا پھر جلدی سے وضاحت کی "بات یہ ہے کہ اسی دن میرا اس سے جھگڑا ہوا تھا۔ ممکن ہے' اس وجہ سے وہ تاوان ادا نہ کرے۔ یہ ضروری ہے کہ میں معذرت کر لوں۔ ورنہ ممکن ہے کہ وہ آدھا تاوان ادا کرے۔ صرف اپنے بیٹے کے لئے کیونکہ وہ جان گیا ہے کہ میں اس سے محبت نہیں کرتی ہوں مگر عقاب' یہ تو سوچو کہ ہمیں دولت کی ضرورت تو ہے۔ ہے نا؟" اس نے ہمیں پر خاص طور پر زور دیا۔

"تم اس سے کیا کہنا چاہتی ہو شیریں؟"

شیریں کی امید بندھنے لگی۔ شاید اسے یقین آ گیا ہے "صرف معذرت کرنا چاہتی ہوں ڈیئر" اس نے لہجے میں حلاوت بھرتے ہوئے کہا اور اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھپتھپانے لگی "اور تم جلال سے کیا کہلوانا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتا ہے۔ اچھا دیکھو' جیسے ہی میں ریکارڈر کا بٹن دباؤں' تم بات شروع کر دینا۔"

شیریں کا جسم تن سا گیا۔ یہ بڑا نازک اور اہم مرحلہ تھا پھر عقاب نے ریکارڈر کا بٹن دبایا اور اس نے بولنا شروع کیا۔ وہ لکھا ہوا پیغام آہستہ آہستہ ریکارڈ کرا رہی تھی پھر اس نے توقف کیا "کمال' اب جلال تم سے بات کرے گا لیکن اس سے پہلے میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں غلطی پر تھی۔ امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔"

عقاب نے ہاتھ بڑھا کر آف کا بٹن دبا دیا "اتنی معذرت کافی ہے شیریں۔ اب جلال کو بولنے دو۔"

شیریں نے جلال کو خود سے لپٹاتے ہوئے کہا "جلال.... اب تم اپنے بابا جانی سے بات کرو۔"

جلال کی سانسوں کی کھڑکھڑ بڑھ گئی "میں خیریت سے ہوں بابا جانی۔ شیریں آنٹی میرا خیال رکھ رہی ہیں لیکن بابا جانی' ماما کو میرا یہاں ہونا بالکل اچھا نہیں لگے گا" عقاب نے پھر آف کا بٹن دبا دیا۔

شیریں دل میں جلال کو سراہ رہی تھی۔ وہ یقیناً بے حد ذہین بچہ تھا۔ اس نے باپ کو ایک پیغام دینے کی موثر کوشش کی تھی۔ اس نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس اغوا کا تعلق اس کی ماما کے قتل سے بھی ہے۔

عقاب نے کیسٹ ری وائنڈ کیا اور پھر چلا کر دیکھا پھر وہ شیریں کی طرف دیکھ کر مسکرایا "ٹھیک ہے جانم" اس نے ریکارڈڈ کیسٹ جیب میں رکھ لیا۔

اس لمحے جلال' شیریں کی آستین پکڑ کر کھینچنے لگا "شیریں آنٹی' مجھے...."

"تمہیں باتھ روم جانا ہے بچے؟" عقاب نے جلال کو اٹھایا اور اسے ٹوائلٹ میں لے گیا۔ بچے کو وہاں بٹھا کر وہ باہر آیا اور دروازہ بند کر لیا۔ ایک منٹ بعد جلال باہر نکلا۔ عقاب اسے اٹھا کر لے آیا۔ اس نے اسے پلنگ پر پٹخ دیا۔ بچے کے جسم میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔

"تمہیں بھی جانا ہے شیریں؟" عقاب نے پوچھا۔

شیریں نے اثبات میں سرہلا دیا۔

عقاب نے اسے کسی گڑیا کی طرح اٹھا لیا اور ٹوائلٹ میں لے گیا "یہاں چٹخنی ہے۔ تم لگا سکتی ہو کیونکہ دروازہ بند ہونے کی اور کوئی صورت نہیں مگر تم فوراً ہی باہر آ جانا" اس نے انگلی سے شیریں کا رخسار سہلایا "کیونکہ تم باہر نہیں آؤ گی تو بچہ جان سے جائے گا" یہ کہہ کر وہ باہر آ گیا۔

شیریں نے اندر سے چٹخنی چڑھائی اور دیوار کو ٹٹولنے لگی پھر اس نے ٹینک کو ٹٹولا کہ ممکن ہے' کوئی ایسی چیز مل جائے' جسے وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔

"جلدی کرو شیریں" باہر سے عقاب نے پکارا۔

"آ رہی ہوں" شیریں چٹخنی سرکانے لگی تو اسے چٹخنی کے ڈھیلے ہونے کا احساس ہوا۔ اس نے چٹخنی کو نکالنے کی کوشش کی لیکن چٹخنی اٹکی ہوئی تھی پھر اس نے چٹخنی کا خیال دل سے نکالا اور دروازہ کھولا۔

"میں کہتا ہوں' باہر آؤ۔" باہر عقاب گرجا۔

شیریں نے دروازہ کھول کر نکلنے کی کوشش کی۔ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے وہ لڑکھڑائی۔ عقاب اس کی طرف بڑھا وہ دانستہ اس سے لپٹنے لگی۔ اس نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ کراہت کے احساس کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اس نے اس کا رخسار چوما۔ عقاب کی بانہوں کی گرفت سخت ہونے لگی۔

شیریں کو اپنا دل حلق میں دھڑکتا محسوس ہوا.... خدایا.... خدایا پلیز.... وہ اپنا ہاتھ اس کے کندھے کے نیچے سے پشت پر لے گئی۔ اس کا داہنا ہاتھ اس کے کوٹ کی جیب میں داخل ہوا۔ کسی سرد دھاتی چیز سے ٹکرایا....

عقاب نے اسے کنکریٹ کے فرش پر دھکیل دیا۔ شیریں کی ٹانگیں مڑ گئیں۔ اس کے ٹخنے میں اذیت کی شدید لہر دوڑ گئی....

"تم بھی دوسری عورتوں کی طرح ہو شیریں" عقاب نے گرج کر کہا۔ شیریں گری ہوئی تھی اور وہ اس کے پاس تن کر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے مسخ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھ بری طرح پھڑک رہی تھی۔ نگاہوں میں نفرت ہی نفرت تھی "تم بہت بری ہو.... تمام عورتوں کی طرح" اس نے بے حد نفرت سے کہا پھر اس نے اسے اٹھایا اور پلنگ پر پٹخ دیا۔

اس نے تیزی سے اس کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیئے۔

"میرا ٹخنا" شیریں کراہی۔

"آنٹی' کیا ہوا؟" جلال کے لہجے میں پریشانی تھی۔

شیریں نے کوشش کر کے اپنے لہجے کو اذیت سے پاک رکھنے کی کوشش کی "میں ' گر گئی تھی۔"

"دوسری عورتوں کی طرح' جھوٹ بول کر دھوکا دینے والی لیکن ان سے بھی بد تر۔ مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔"

شیریں کو اس کے ہاتھ کا دباؤ پہلے اپنے منہ پر اور پھر گلے پر محسوس ہوا پھر دباؤ بڑھنے لگا۔ وہ مدد کے لئے خدا کو بے آواز پکار رہی تھی۔

دباؤ ہٹ گیا اور اس کا سر پیچھے کی طرف گرا۔

"آنٹی.... شیریں آنٹی...." جلال روتے ہوئے اسے پکار رہا تھا۔

گہری سانس لے کر پھیپھڑوں میں ہوا بھرتے ہوئے وہ بچے کی طرف مڑی۔

عقاب سنک کے پاس کھڑا چہرے پر پانی کے چھپکے مار رہا تھا۔ وہ خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیریں جانتی تھی کہ ابھی چند لمحے پہلے وہ اسے ختم کرنے والا تھا پھر کس چیز نے اسے روک لیا؟ پھر بھی.... اب بچت کا کوئی راستہ نہیں.... کوئی راستہ نہیں۔ کل جب وہ تاوان کی رقم وصول کر لے گا تو اسے اور جلال کو ختم کر دے گا۔

فرش پر گرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑا تھا اور ٹخنا جوتے کے نیچے دبا تھا۔ اب اس کا ٹخنا سوج گیا تھا اور اب نائیلون کی ڈوری اس میں گھسی جا رہی تھی۔ بہت زیادہ تکلیف ہو رہی تھی خدایا.... میری مدد کر۔

عقاب نے رومال سے اپنے چہرے کو خشک کیا پھر وہ پلنگ کی طرف آیا۔ اس نے جلال کے ہاتھ باندھے' ان دونوں کے منہ میں کپڑا ٹھونسا پھر سوٹ کیس سے نکلے ہوئے تار کو دروازے میں اٹکایا "شیریں' میں پھر آؤں گا.... کل" اس نے کہا۔

وہ جانتا تھا کہ اگر وہ یہاں ٹھہرا رہا تو شیریں کو ختم کر دے گا۔ جب کہ اسے بعد میں شیریں کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ ممکن ہے' اسے بعد میں بھی کسی وقت شیریں اور بچے کی زندگی کا ثبوت فراہم کرنا پڑے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں نہیں کاٹنا چاہتا تھا۔

سرنگ کے تاریک دہانے میں کھڑا وہ انتظار کرتا رہا۔ گیارہ بجے والی ٹرین آئی مسافر اترے تو وہ ان میں گھل مل گیا اور اوپر چلا آیا۔

وہ بے حد مضطرب تھا۔ ایسے میں ہوٹل کا کمرا اس کے لئے کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ ایک اور بے وفائی! اور تنہائی بے وفائی کی اذیت کو بڑھا دیتی ہے۔ چنانچہ اسٹیشن سے نکل کر وہ پیدل ہی چلتا رہا پھر وہ ایک سینما ہال میں گھس گیا' جہاں ایک بے حد گرم فلم کی نمائش ہو رہی تھی۔

چار بجے وہ اسٹیشن واپس آیا اور سمنان جانے والی ٹرین میں بیٹھ گیا۔

اس کی نظر کمال آفندی پر اس وقت پڑی' جب وہ ٹرین میں بیٹھ چکا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کے پاس اخبار تھا۔ اس نے اخبار کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی مرحلے پر اسے پہچانا جائے۔

کمال آفندی کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ یہ اچھا شگون تھا۔ اس سوٹ کیس میں دولت' جو آج رات اس کی ہو جائے گی۔

سمنان کے اسٹیشن پر وہ کمال آفندی کے جانے کا انتظار کرتا رہا پھر اپنے گیراج کی طرف چل دیا۔ بدشکل' بدنما گیراج ایک بند گلی کے کنارے پر تھا۔ وہاں بورڈ لگا تھا۔ شہباز آٹو ریپئر۔ وہ دروازہ کھول کر اندر گیا۔ اس کے نام کوئی پیغام' کوئی خط موجود نہیں تھا۔ اس نے طمانیت سے سر ہلایا۔ گیراج سرد اور گندہ تھا۔ سینٹرل ریلوے اسٹیشن کے اس کمرے سے بھی بد تر۔ اب تک اسے ایسے ہی ٹھکانے نصیب ہوئے تھے۔

اس کی ڈارک گرے فوکسی وہاں موجود تھی.... روانگی کے لئے بالکل تیار۔ اس پر جعلی نمبر پلیٹ لگی تھی۔ اس نے اس کا انجن بھی ریتی سے گھس کر مٹا دیا تھا۔ سی بی ریڈیو بھی احتیاطاً نکال دیا تھا۔

وہ گیراج میں پیٹرول بھی رکھتا تھا۔ اس کے بڑے فائدے تھے۔ کسٹمرز کو بھی وہ ضرورت کے وقت پیٹرول دے دیتا تھا اور رات کی سرگرمیوں میں بھی وہ اس کے کام آتا تھا۔ کہیں کوئی اکیلی عورت مل جاتی تو.... پیٹرول ختم ہو گیا مادام؟ کوئی بات نہیں۔ میری ڈکی میں پیٹرول کے دو ڈبے ہیں۔ میں تو کام ہی یہی کرتا ہوں.... کاروں کی مرمت کا....

اس نے چھ سال کے عرصے میں بے شمار نمبر پلیٹیں جمع کی تھیں.... اور کاروں کی چابیاں بھی اس کے پاس بڑی تعداد میں تھیں۔ نمبر پلیٹوں سے تو اس نے چھٹکارا پا لیا تھا۔ پچھلے دو ماہ سے وہ بہت نروس ہو رہا تھا۔ اس نے کام بھی زیادہ نہیں کیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس نے پچھلے ہفتے خرم سعیدی کی گاڑی کا کام کیا تھا.... اور بہترین کام کیا تھا۔ وہ بعد میں اس کے ہی کام آئی تھی۔ اس نے پورے اعتماد سے اس گاڑی کا انتخاب کیا تھا۔

وہ گیراج کے عقب میں بنے چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں ایک سنگل بیڈ تھا۔ اس کے نیچے سے اس نے ایک بوسیدہ سوٹ کیس نکالا پھر کونے میں کھڑے خستہ حال ڈریسر میں سے اس نے اپنے کپڑے نکالے اور انہیں سوٹ کیس میں رکھنے لگا۔

اس نے جیب سے کیسٹ ریکارڈر نکالا اور شیریں اور جلال کے پیغام کو دوبارہ سنا۔ اس کے پاس ایک اور ریکارڈر بھی تھا' جو ڈریسر پر رکھا تھا۔ اس نے اسے لا کر بیڈ پر رکھا۔ پھر کیسٹوں کے انبار میں ٹٹولنے لگا۔ اس نے ایک کیسٹ ڈھونڈ کر نکالا اور شیریں اور جلال کے پیغام کو ایڈٹ کر کے دوسرے کیسٹ پر ریکارڈ کیا۔ اس کے لئے وہ اہمیت او پننگ ہی کی تھی۔ اس دوسری کیسٹ کو اس نے ایک لفافے میں بند کر کے ٹیپ سے چپکا دیا پھر سرخ مارکر سے وہ لفافے پر پیغام لکھنے لگا۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے ضروری کیسٹ اور ریکارڈر بھی سوٹ کیس میں رکھ دیئے پھر سوٹ کیس کو لاک کر کے وہ اسے باہر کھڑی کار میں رکھ آیا۔ فلائٹ کے دوران میں تو اسے رقم والے سوٹ کیس کی زیادہ فکر کرنی تھی۔ یہ سوٹ کیس بیگج میں چلا جائے گا۔

اس نے گیراج کو لاک کیا اور کار میں بیٹھتے ہوئے انجن اسٹارٹ کیا "اب علی میاں کی درگاہ چلو" اس نے مسکراتے ہوئے خود سے کہا "واپسی میں' میں' تمہیں بیئر پلواؤں گا۔"

"میں یقین نہیں کر سکتا" کمال نے فیروز ہمدانی سے کہا "تم اسے جھوٹی واردات سمجھو گے تو شیریں اور جلال کی زندگی کو خطرے میں ڈال دو گے۔"

وہ ابھی تہران سے واپس پہنچا تھا اور پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنے ڈرائنگ روم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ فیروز ہمدانی اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کے اندر جھنجلاہٹ تھی۔ اس شخص نے خود کو جیسے کسی آہنی خول میں چھپا رکھا تھا لیکن صرف چند گھنٹوں میں وہ اپنی عمر سے دس سال بڑا لگنے لگا تھا۔

"آقائے آفندی' آپ یقین رکھیں۔ ہمارا طرز عمل ویسا ہی ہے' جیسا ایک سنگین واردات کے بعد ہوتا ہے" فیروز نے سرد لہجے میں کہا "تاہم ہم یقین رکھتے ہیں کہ یہ واردات جواد اصغر کو سزائے موت سے بچانے کے لئے کی گئی ہے۔"

"میں نہیں مانتا" کمال نے تند لہجے میں کہا "ابھی تک کیسٹ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔"

"نہیں۔ مجھے افسوس ہے۔"

"تب تو ہم انتظار کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔"

"جی ہاں اور آپ کو آدھی رات کو تہران روانگی کے لئے بھی تیار رہنا ہے۔ آقائے آفندی' سڑکوں کی صورت حال تشویش ناک حد تک خراب ہے۔"

"تمہارے خیال میں عقاب خوف زدہ ہو گا؟ اسے پھنس جانے کا ڈر ہو گا؟"

فیروز نے سر جھٹکا "اس معاملے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال ہم نے فون بوتھ میں آواز ٹیپ کرنے کا پورا بندوبست کر لیا ہے مگر میرا خیال ہے کہ وہ فون کر کے آپ کو کسی اور بوتھ میں طلب کرے گا پھر بھی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے آدمی آپ کا تعاقب کرتے رہیں گے۔ آپ کی کار میں تمام ضروری آلات نصب کر دیئے گئے ہیں۔"

اسی وقت سائرہ کمرے میں آئی "آقائے آفندی' آپ نے کب سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ کچھ پکاؤں آپ کے لئے؟"

"ضرور پکائیں خاتون.... اور کوئی بہت مزے کا کھانا پکائیں" فیروز ہمدانی نے جلدی سے کہا پھر اس نے کمال کا ہاتھ تھپتھپایا۔ "آپ نے کل سے اب تک کچھ نہیں کھایا ہے اور آج آپ کو ایک سخت مرحلہ درپیش ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ کمزور نہ ہوں۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم" کمال نے مختصراً کہا۔

وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ "میں جاتا ہوں۔" فیروز ہمدانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کمال کی بھوک اڑ گئی۔ اس نے نیپکن ایک طرف ہٹا دیا۔ کیا پتا' کیسٹ آیا ہو۔ جلال کی.... شیریں کی آواز!

فیروز واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک جانا پہچانا شخص تھا۔ وہ فرید صادق تھا.... جواد اصغر کا وکیل صفائی۔ وہ کچھ پریشان اور برہم نظر آ رہا تھا۔ اس کا سوٹ بھی سلوٹ زدہ تھا' جیسے وہ اسی میں سویا ہو۔

"آقائے آفندی' میں آپ کے بیٹے کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسی بات؟" کمال اچھل پڑا۔ فیروز نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا تو وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"دیکھئے... جواد اصغر نے آپ کی بیوی کو قتل نہیں کیا۔ عدالت نے اسے مجرم اس لئے قرار دیا کہ ان کے خیال میں رخسار جلالی اور افشاں مجیدی کو اسی نے قتل کیا تھا۔"

"لیکن اس کا ریکارڈ...."

"وہ معمولی سی بات تھی اور ایک ہی واقعہ تھا۔"

"اس نے ایک لڑکی پر حملہ کیا تھا۔ اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔"

"آپ صورت حال پر تو غور کریں۔ وہ اس وقت پندرہ سال کا تھا۔ ایک پارٹی میں شریک تھا اور چند لڑکوں سے اس کا بیئر پینے کا مقابلہ ہو رہا تھا اور اسی دوران میں کسی نے بیئر میں کوئی بہت نشہ آور چیز ملا دی۔ اسے تو یاد بھی نہیں کہ اس نے اس لڑکی کو

چھوا بھی تھا۔ وہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ اس نے پی۔ اس کی بدقسمتی کہ وہی موقع اسے مصیبت میں پھنسا گیا پھر یہ بھی اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ آپ کی بیوی کے قتل کے فوراً بعد آپ کے گھر میں داخل ہوا...." فرید صادق کی آواز لرزنے لگی۔ اب وہ تیز تیز بات کر رہا تھا "آقائے آفندی' میں مقدمے کی کارروائی کی تفصیل کا جائزہ لیتا رہا ہوں۔ کل میں نے پھر جواد کو ہر بات کئی کئی بار دہرانے پر مجبور کیا۔ اس کے اور آپ کی بیوی کے درمیان اسٹور پر کیا بات ہوئی اور پھر کس طرح وہ آپ کے گھر میں داخل ہوا.... اور آپ کی بیوی کو مردہ پایا۔ کل اس کی باتیں سنتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے۔

"آقائے آفندی' آپ کے بیٹے جلال نے بتایا کہ وہ نیچے آیا.... آوازیں سن کر۔ اس نے دیکھا کہ کوئی شخص اس کی ماں کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا...."

"جی ہاں۔ جواد اصغر کا چہرہ!"

"جی نہیں۔ یہ مقدمے کی کارروائی کا ریکارڈ دیکھئے۔" فرید صادق نے اپنے بریف کیس سے کاغذات نکالے "سرکاری وکیل نے جلال سے پوچھا تھا کہ اسے اتنا یقین کیسے ہے کہ اس کی ماما کا گلا گھونٹنے والا جواد ہی تھا۔ جلال نے جواب دیا تھا "لائٹ آ گئی تھی۔ اس لئے میں نے صاف دیکھا تھا...." فرید صادق نے گہری سانس لی "میں یہ مس کر گیا لیکن کل جب جواد تمام باتیں دہرا رہا تھا تو اس نے کہا.... میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ جبکہ جلال نے گھنٹی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔"

"اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔" فیروز ہمدانی نے مداخلت کی "جلال اوپر ٹرینوں سے کھیل رہا تھا۔ اس میں شور ہوتا ہے۔ اس نے گھنٹی کی آواز نہیں سنی ہو گی۔"

"آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ جلال نے کہا تھا.... لائٹ آ گئی تھی.... آقائے آفندی' یہی میرا پوائنٹ ہے۔ جواد نے اطلاعی گھنٹی دو بار بجائی پھر وہ گھر میں داخل ہوا۔ اس طرح اس نے قاتل کو فرار ہونے کی مہلت دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ عقبی دروازہ کھلا ہوا پایا گیا۔" وہ کہتے کہتے رکا اور اپنے جوش پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا

"جواد نے کچن میں داخل ہوتے ہی کچن کی لائٹ آن کی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا آقائے آفندی' جلال نے جواد کو اس لئے دیکھا کہ اس وقت کچن کی طرف سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ جلال جب پریشان ہو کر نیچے آیا اور اس نے دیکھا کہ کوئی اس کی ماما کا گلا گھونٹ رہا ہے تو اس وقت ڈرائنگ روم میں اندھیرا تھا۔ اس لئے کہ کچن کی لائٹ آن نہیں تھی۔ یہ ناممکن تو نہیں کہ کچھ دیر کے لئے بچے کے حواس جواب دے گئے ہوں اور جب حواس بحال ہوئے ہوں تو کچن سے لائٹ ڈرائنگ روم میں آ رہی ہو۔ منظر وہی تھا۔ یعنی کوئی اس کی ماما پر جھکا ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے وہ اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا... اور اب اس کا چہرہ اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ بچہ یہ تو نہیں سمجھ سکا ہو گا کہ چند لمحوں کے لئے اس کا ذہن صاف ہو گیا تھا اور اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس نے دو اشخاص کو دیکھا تھا۔ پہلا اسکارف کی مدد سے اس کی ماما کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ جبکہ دوسرا اس کی ماما کے گلے کو اسکارف کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جواد کو احساس ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔ تب وہ گھبرا کر بھاگا۔ آپ سوچیں تو' وہ اگر قاتل ہوتا تو اس بچے کو زندہ نہ چھوڑتا جو اس کے جرم کا عینی شاہد تھا۔"

فیروز ہمدانی نے نفی میں سر ہلایا "یہ سب تمہارا قیاس ہے.... ثبوت سے محروم قیاس۔"

"اگر آپ مجھے جلال سے پوچھ گچھ کرنے کی اجازت دے دیں تو ثبوت بھی مل جائے گا۔" فرید صادق کے لہجے میں التجا تھی۔

"یہ...یہ ناممکن ہے۔" کمال نے کہا پھر اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اس کے منہ سے یہ بات نکلنے ہی والی تھی کہ ایک ایسے بچے سے کوئی کیسے پوچھ گچھ کر سکتا ہے' جو اغوا ہو چکا ہو "بس.... تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"نہیں..... میں نہیں جاؤں گا۔" فرید صادق نے ہٹ دھرمی سے کہا پھر ہچکچاتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنا بریف کیس کھولا "مجھے افسوس ہے آقائے آفندی کہ میں یہ آپ کو دکھا رہا ہوں۔ یہ آپ کے گھر کی وہ تصویریں ہیں' جو آپ کی بیوی کے قتل کے بعد لی گئی تھیں۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔" فیروز ہمدانی نے کہا اور تصویروں کی طرف ہاتھ بڑھایا "یہ تمہیں کہاں سے ملیں؟ یہ تو سرکاری دستاویزات ہیں۔"

"آپ اس میں نہ الجھیں کہ یہ مجھے کیسے ملیں۔ آپ یہ تصویر دیکھیں۔ کتنی زیادہ روشنی نظر آ رہی ہے۔ کچن کی چھت کا گلوب روشن ہے نا' اس لئے۔ ابھی میں آپ کو دکھاتا ہوں۔" وہ ڈرائنگ روم اور کچن کے درمیانی دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھول دیا پھر اس نے ڈرائنگ روم کی لائٹ آف کر دی "دیکھیں کچن سے آنے والی روشنی اتنی ہے کہ یہاں سب کچھ نظر آ رہا ہے اور اب دیکھیں.... وہ کچن میں گیا اور اس نے کچن کے گلوب کا سوئچ آف کر دیا۔

کمال اور فیروز سحرزدہ بیٹھے یہ سب دیکھ اور سن رہے تھے۔

"اب دیکھیں۔" فرید صادق نے التجائیہ لہجے میں کہا "اب یہاں ڈرائنگ روم میں تقریباً اندھیرا ہے۔ ایسے میں جلال سیڑھیوں سے کیا دیکھ سکتا تھا؟ محض ہیولے.... سائے! جیسے کوئی سایہ اس کی ماما کا گلا گھونٹ رہا ہو پھر شاید وہ خوف سے بے ہوش ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اطلاعی گھنٹی کی آواز نہیں سنی۔ جواد اصغر نے دو بار بیل بجائی پھر وہ اندر آ گیا۔ اس دوران میں قاتل عقبی دروازے سے فرار ہو گیا۔ جواد نے اندر آتے ہی کچن کی روشنی آن کی پھر وہ آپ کی بیوی کی طرف بڑھا۔ اسے بھی شاک لگا۔ وہ ان کے گلے میں پڑا اسکارف کھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جلال کو ہوش آ گیا۔ اب کے جلال نے اس کا چہرہ دیکھا.... کیونکہ روشنی تھی۔ یہی جلال نے بیان میں کہا کہ لائٹ آ گئی تھی۔" فرید صادق نے گہری سانس لی "آقائے آفندی' میرا تو خیال ہے کہ اس روز آپ کے بچے کی زندگی صرف اس لئے بچ گئی کہ جواد اصغر عین لمحے پر نازل ہو گیا تھا اور اسے اس کا صلہ کیا ملا.... سزائے موت!"

ممکن ہے کہ وہ لڑکا جواد اصغر بے قصور ہو۔ کمال نے یہ سب سننے اور دیکھنے کے بعد سوچا۔

کمال نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ فیروز ہمدانی اس کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ کمال اس کا سبب بھی جانتا تھا اگر وہ اعتراف کرتا ہے کہ جلال کو اغوا کر لیا گیا ہے تو فرید صادق اسے نازنین کے قتل سے متعلق قرار دے گا۔ اس کے نتیجے میں

پبلسٹی ہو گی۔ اس کے بعد جلال اور شیریں کی عافیت ناممکن ہو جائے گی۔

"میں نے اپنے بیٹے کو اس شہر سے دور بھیج دیا ہے۔" کمال نے کہا "کیونکہ مجھے سزائے موت کے حق میں ڈٹے رہنے کی وجہ سے دھمکیاں مل رہی تھیں۔ اب میں کسی کو بتا ہی نہیں سکتا کہ جلال کہاں ہے۔"

فرید صادق کے کندھے جھک گئے۔ وہ مایوس ہو گیا اور کاغذات بریف کیس میں رکھنے لگا۔ اچانک اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا "آقائے آفندی' ایک 19 سالہ لڑکا ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں سزائے موت پانے والا ہے۔ آپ کو اس کا ملال بھی نہیں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ سزا عدالت نے سنائی ہے' میں نے نہیں۔"

فرید صادق نے بریف کیس بند کرتے کرتے ہاتھ روکا اور گزشتہ روز جواد کا جو بیان اس نے ٹیپ کیا تھا' اس کا اسکرپٹ نکال کر میز پر پٹخ دیا "آپ اسے پڑھ کر دیکھیں آقائے آفندی۔" اس نے تیز لہجے میں کہا "پھر سوچیں کہ کیا یہ کسی قاتل کی باتیں ہیں۔ ایسے قاتل کی' جس نے تین عورتوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا ہو اور یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ اب جو دو قتل ہوئے ہیں تو جواد جیل میں تھا۔ گویا قاتل کوئی اور ہے اور میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ دو قتل جس نے کئے ہیں' وہی ان تین عورتوں کا قاتل ہے' جن کی سزا جواد اصغر کو مل رہی ہے۔ یاد رکھیں' ان میں سے ہر عورت کا گلا یا تو اس کے اسکارف سے گھونٹا گیا ہے یا بیلٹ سے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کی بیوی کا قتل گھر میں ہوا تھا۔ باقی تمام عورتیں کسی سڑک پر قتل کی گئیں۔" یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل گیا۔

کمال نے فیروز ہمدانی کو دیکھتے ہوئے پوچھا "ممکن ہے' وہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔"

"وہ ایک وکیل ہے' جو اپنے موکل کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔" فیروز نے سرد لہجے میں کہا "آپ پلیز' کھانے کی طرف توجہ دیں۔"

کمال نے اثبات میں سرہلایا اور بے دلی سے کھانے لگا۔ فرید صادق کا چھوڑا ہوا اسکرپٹ اس کے ہاتھ کے پاس ہی رکھا تھا۔ وہ سب سے اوپر رکھے کاغذ کی عبارت پڑھنے لگا....

"میں بہت افسردہ تھا کہ روزگار جا رہا ہے لیکن آقائے تیمور بھی کیا کرتے۔ انہیں

ایسا ملازم درکار تھا' جو دکان کو زیادہ وقت دے سکے۔ میرا مسئلہ یہی تھا کہ فٹ بال کی وجہ سے مجھے یونیورسٹی میں داخلہ بھی مل سکتا تھا اور وظیفہ بھی۔ میرے لئے فٹ بال کی پریکٹس چھوڑنا ناممکن تھا۔ بہرحال خاتون آفندی نے میری اور آقائے تیمور کی گفتگو سن لی تھی۔ انہیں افسوس ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون کون سے کام کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ حال ہی میں نئے گھر میں منتقل ہوئی ہیں اور انہیں گھر میں رنگ کرانا ہے۔ میں نے کہا کہ میں وہ بھی کر سکتا ہوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ شام کو میں ان کے گھر آ کر دیکھ لوں کہ کام کس طرح کرنا ہے۔ اس وقت میں ان کا سودا ان کی کار کی ڈکی میں رکھ رہا تھا۔ میں نے ان سے کہا "یہ میرا لکی ڈے ہے۔ بدقسمتی خوش قسمتی میں تبدیل ہو گئی۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں...."

'وہ ہنسیں اور انہوں نے مذاق میں کہا "یہ میرا لکی ڈے ہے۔ اس لئے کہ آج ڈکی میں اتنی جگہ ہے کہ پورا سامان سما گیا ہے۔ ورنہ ٹائر کافی جگہ گھیرتا تھا۔"

"اس وقت چار بجے تھے اور جب میں...."

کمال پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ نازنین کا لکی ڈے!

فون کی گھنٹی بجی۔ وہ فون کی طرف لپکا۔ شاید کوئی اچھی خبر ہو.... لکی نیوز!

"آقائے آفندی.... کمال آفندی؟" دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز نے پوچھا۔

"جی بول رہا ہوں۔"

"آقائے آفندی' میں علی میاں کی درگاہ کا مجاور ہوں۔ ایک غیر معمولی وجہ سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔"

کمال کا دل بری طرح دھڑکا "جی.... فرمایئے۔"

"ابھی بیس منٹ پہلے اپنے حجرے کے دروازے پر مجھے ایک پیکٹ پڑا ملا ہے۔ اس پر آپ کا نام اور فون نمبر لکھا ہے اور لکھا ہے کہ میں یہ امانت آپ تک پہنچا دوں۔ لفافے پر یہ بھی لکھا ہے کہ یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے آقائے آفندی' یہ کوئی مذاق تو نہیں؟"

کمال کے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا "نہیں حضرت' یہ مذاق نہیں۔ میں ابھی پہنچ

رہا ہوں۔ برائے مہربانی' آپ اس بارے میں کسی سے بھی بات نہ کیجئے گا۔"

○

آدھے گھنٹے بعد کمال اپنے گھر واپس آیا تو فیروز ہمدانی ٹیپ ریکارڈر تیار کئے بیٹھا تھا۔ اس نے بے صبری سے کیسٹ لگایا اور ٹیپ ریکارڈر کو آن کیا۔

وہ سناٹے میں بیٹھے شیریں پاشا کی آواز سنتے رہے۔ وہ عقاب کا لکھا ہوا پیغام دہرا رہی تھی۔ کمال کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"....میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں غلطی پر تھی۔ امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے۔"

کمال سوچ کر الجھتا رہا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ شیریں معافی کیوں مانگ رہی ہے؟ یہ کس غلطی کا حوالہ ہے؟

اب جلال کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سانسوں کی کھڑکھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ رک رک کر بول رہا تھا۔

کمال پھر الجھنے لگا۔ جلال نے نازنین کا حوالہ کیوں دیا ہے؟ اس کی کیا تک ہے؟ ایسی صورت حال میں وہ پرانا حوالہ کیوں؟

اس نے مٹھیاں یوں بھینچیں کہ انگلیوں کی پوریں سفید پڑ گئیں پھر اس نے اپنی سسکیوں کو سینے میں ہی گھونٹنے کے لئے اپنا ہاتھ اپنے منہ میں ٹھونس لیا۔

کیسٹ چل رہا تھا پھر اچانک ایک نغمہ بار آواز ابھری۔ "ارے.... بہت شکریہ۔ آؤ.... اندر آ جاؤ۔"

کمال اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے حلق سے بے ساختہ آواز نکلی.... حیرت کا اظہار!

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" فیروز ہمدانی پریشان ہو گیا۔

"یہ.... یہ میری بیوی کی آواز ہے۔" اس کے لہجے میں ہیجان تھا "ہاں.... یہ نازنین کی آواز ہے۔"

○

فیروز ہمدانی کا ماتحت ناصر نو روز بار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ باہر کھڑکی سے دیکھنے پر

نیم تاریک بار اندر سے خالی نظر آیا۔ یہ اس کے نکتہ نظر سے اور اچھا تھا۔ وہ بارمین سے زیادہ بہتر طور پر اور آزادانہ گفتگو کر سکتا تھا۔

وہ بار میں داخل ہوا۔ وہاں چار افراد پہلے سے موجود تھے۔ وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور بارمین سے بیئر طلب کی۔

بیئر کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ چپکے چپکے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ بار میں موجود افراد بڑے انہماک سے ٹی وی پر دکھایا جانے والا فٹ بال کا میچ دیکھ رہے تھے۔ ایک گنجا شخص جو وضع قطع سے ایگزیکٹو ٹائپ لگتا تھا' برانڈی پی رہا تھا۔

بارمین اس کی طرف متوجہ ہوا "آپ یہاں نئے لگتے ہیں۔ پہلے کبھی نہیں دیکھا آپ کو؟" اس نے ناصر سے کہا۔

"میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ ایک پرانا دوست یاد آیا.... آفاق اصفہانی.... میں اندر چلا آیا۔ آفاق نے بتایا تھا کہ وہ یہاں اکثر آتا ہے۔"

"جی ہاں' آقائے اصفہانی تقریباً ہر رات آتے ہیں۔" بارمین نے کہا "کل ان کی شادی کی سالگرہ تھی۔ وہ بتا رہے تھے کہ بیوی کو لے کر کہیں جانا ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ آج کیا ہو گیا۔ آج تو انہیں یہاں موجود ہونا چاہئے تھا۔ میرا خیال ہے' خاتون نے پھر کھنچائی کی ہو گی ان کی اگر ایسا ہوا ہے تو یہ کہانی بھی ہم ضرور سنیں گے۔ کیوں آقائے شہباز؟"

"ہاں مگر سنتا کون ہے۔ میں تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہوں۔" جس شخص سے بات کی گئی تھی' اس نے بیئر سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

بارمین خوش دلی سے ہنس دیا "بار ہوتے ہی اس لئے ہیں۔ ہر شخص یہاں آ کر اپنے عذاب جھاڑ دیتا ہے۔"

فٹ بال دیکھنے والوں نے ٹی وی بند کر دیا "یہ صاحب آقائے اصفہانی کے دوست ہیں۔" بارمین نے ناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو بتایا پھر وہ ناصر کی طرف مڑا "ان سے ملئے۔ یہ الیاس اور یہ صالح ہیں۔"

"میرا نام اشفاق حسین ہے۔" ناصر نے جھوٹ بولا "کیا خیال ہے' میری طرف سے بیئر قبول کریں گے آپ لوگ؟"

ناصر کو وہاں ایک گھنٹے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔ الیاس اور صالح سیلزمین تھے اور شہباز کار مکینک۔ ایگزیکٹو ٹائپ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتا تھا۔

پھر الیاس اور صالح جانے کے لئے اٹھے۔ انہوں نے اپنا بل ادا کیا۔ ذرا دیر بعد شہباز بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ بار مین نے اس کے پیسے واپس کر دیئے "آج آپ میرے مہمان تھے آقائے شہباز۔ ہم سب آپ کی کمی محسوس کریں گے۔"

"گڈ لک شہباز۔ خط لکھتے رہنا۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔" الیاس نے شہباز سے کہا۔

"شکریہ۔ وہاں بات نہیں بنی تو میں واپس آ جاؤں گا اور کسی شو روم میں ملازمت کر لوں گا۔ ایک شو روم والا تو میرے پیچھے پڑا ہے۔" شہباز نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ تم یقیناً ایک غیر معمولی مکینک ہو۔" صالح بولا۔

"تو آپ کہاں جا رہے ہیں؟" ناصر نے شہباز سے پوچھا۔

"کاشان جا رہا ہوں.... قسمت آزمائی کے لئے۔"

"افسوس.... تمہیں آفاق سے الوداعی ملاقات کا موقع نہیں ملا۔" الیاس نے کہا۔

شہباز ہنس دیا "کاشان تبریز تو نہیں ہے۔ میں پھر واپس آؤں گا۔ اچھا' چلتا ہوں۔"

وہ چاروں ایک ساتھ بار سے نکلے۔ ناصر شہباز کو دیکھتا رہا۔ وہ دروازے سے نکل گیا تو وہ بولا "اس شہباز کی آفاق سے بڑی دوستی تھی؟"

بارمین نے نفی میں سر ہلایا "جو شخص بھی سننے کا حوصلہ رکھتا ہو' وہ آفاق کا بہترین دوست ثابت ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔ "کیونکہ صرف دو جام حلق سے اتارنے کے بعد آفاق جو بولنا شروع کرتا ہے تو بس...."

"اچھا۔ سنو' تم بھی میری طرف سے پیو نا۔"

"ضرور۔ شکریہ۔ یہ بڑی سوگوار رات ہے۔ کل اس لڑکے جواد اصغر کو پھانسی دی جائے گی۔"

"ہاں۔ قانون شکنی آخر میں آدمی کو پھانسی گھاٹ ہی پہنچاتی ہے۔" ناصر نے سرد

لہجے میں کہا "قاتل کا یہی انجام ہونا چاہیے۔"

بارمین نے نفی میں سر ہلایا "بیشتر لوگ اسے قاتل نہیں سمجھتے۔ مجھے بھی وہ قاتل نہیں لگتا مگر کہا جاتا ہے کہ بعض بے رحم قاتل بھی صورت شکل سے عام آدمی لگتے ہیں۔"

"یہ درست ہے۔"

"آپ کو پتا ہے' آفاق اور سائرہ اس خاتون کے گھر میں رہتے ہیں' جسے قتل کیا گیا تھا۔ آفاق کہہ رہا تھا کہ بچے کو اب بھی ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔"

"ہاں بھئی' بچے کا ذہن تو بہت نازک ہوتا ہے۔"

"آفاق کہہ رہا تھا' بچے کا باپ دوسری شادی کر رہا ہے۔ اس کی ہونے والی بیوی رائٹر ہے لیکن بچہ اس عورت سے مانوس نہیں ہو رہا ہے۔" بارمین چند لمحے خاموش رہا پھر بولا "آپ ایک اور جام لیں گے۔ اب مجھے بار بند کرنا ہے۔"

ناصر چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے اپنا اسپیشل پولیس کا بیج نکال کر اسے دکھایا "میرا تعلق اسپیشل پولیس سے ہے۔"

○

ایک گھنٹے بعد ناصر' کمال آفندی کے گھر پہنچا۔ اس نے فیروز ہمدانی سے بات کی۔ پھر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کیا۔ اس نے بات کرنے سے پہلے کچن اور ڈرائنگ روم کے درمیانی دروازے کو اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ فون پر بہت نیچی آواز میں بات کر رہا تھا "آقائے ہمدانی کا اندازہ درست ثابت ہوا۔" وہ ماؤتھ پیس میں کہہ رہا تھا "آفاق اصفہانی بسیار گو ہے۔ بار میں بیٹھنے والوں کو دو ہفتے سے ہر بات کا علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ کل رات آفاق اور سائرہ فلم دیکھنے جائیں گے۔ سب کو معلوم تھا کہ آقائے آفندی ایک میٹنگ کی وجہ سے دیر... سے گھر آئیں گے اور یہ کہ شیریں پاشا ان کے گھر آئے گی۔ میں نے بارمین سے دس ایسے افراد کے نام اگلوائے ہیں' جو ہر روز بار میں آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو آج بھی موجود تھے۔ ایک آٹو مکینک شہباز ہے' جو کل کاشان جا رہا ہے۔ بے ضرر آدمی لگتا ہے۔ دو سیلزمین ہیں۔ ان پر وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔ باقی نام میں لکھوا رہا ہوں۔ ان کو چیک کرو" اس نے نام

لکھوائے پھر اچانک بولا "اور ہاں' آفاق نے ان سب کو آقائے آفندی کے ٹرسٹ اکاؤنٹ اور اس میں موجود رقم کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس نے آقائے آفندی کی اکاؤنٹنٹ سے گفتگو سن لی تھی۔ او کے؟"

وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں کمال اپنا کوٹ پہن رہا تھا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ کمال کو عقاب کو تاوان ادا کرنے کے لئے جانا تھا۔

○

سرخاب اپنے کمرے پر قبضہ ہو جانے سے بہت پریشان تھی.... اتنی پریشان کہ مین ویٹنگ روم میں شاہین پر نظر پڑی تو اس نے اسے سب کچھ بتا دیا مگر بتاتے بتاتے اسے افسوس ہونے لگا۔ اس نے شاہین کو کمرے میں اپنا شریک بنا لیا تھا۔ اب شاہین وہاں رات گزارنے کو کہتی تو وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن اگلے ہی لمحے اس کا افسوس ڈھل گیا "میں تو وہاں کبھی پھٹکوں بھی نہیں" شاہین نے تھرتھراتی آواز میں کہا "بلیوں سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے اور وہاں بے شمار بلیاں ہیں۔"

"مگر مجھے بلیاں اچھی لگتی ہیں" سرخاب نے خوش ہو کر کہا "بے چاری' بھوکی بلیاں.... ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ لگتا ہے' وہ دونوں وہاں رہنے لگے ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ مرد کی غیر موجودگی میں عورت کو ڈرا کر وہاں سے ہنکاؤں گی۔ تم میری مدد کر سکتی ہو۔ تمہیں مرد پر نگاہ رکھنی ہو گی۔"

شاہین کو سریت بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ مسکرا دی "کیوں نہیں۔"

دونوں نے قہوہ ختم کیا اور نچلے لیول کی طرف چل دیں۔ انہوں نے بک اسٹال کے قریب پوزیشن سنبھالی مگر دونوں ہی کچھ نروس تھیں۔ وہ انتظار کرتی رہیں پھر اچانک سرخاب نے شاہین کے بازو پر دباؤ ڈالا "وہ دیکھو.... وہ جو براؤن کوٹ اور گرین پینٹ پہنے ہوئے ہے۔ وہ ٹریک کی طرف سے آ رہا ہے نا۔ اب میں نیچے جا سکتی ہوں۔"

لیکن شاہین اس سے متفق نہیں تھی "یہ مناسب نہیں۔ اس وقت ارسلان ڈیوٹی پر ہے۔ تم جانتی ہو کہ وہ کتنا سخت ہے۔"

پھر بھی سرخاب ڈٹی رہی۔ ارسلان کھانا کھانے کے لئے گیا تو وہ چپکے سے ٹریک کی

طرف چل دی۔ گھٹیا کی تکلیف کی وجہ سے اس سے زیادہ تیز نہیں چلا جا رہا تھا پھر بھی وہ اپنی بساط سے زیادہ تیز چل رہی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اب زیادہ سے زیادہ دو منٹ میں وہ اس لڑکی کو یہاں سے چلتا کر دے گی۔

گندگی کے پائپوں کے پاس پہنچ کر وہ رکی۔ اس نے فاتحانہ نظروں سے آہنی زینے کو دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ اب اسے اوپر جانے سے کون روک سکتا ہے۔ وہ آگے بڑھی۔ زینے کے پاس پہنچ کر اس نے ریلنگ تھام لی۔

"اے.... تم وہاں کہاں جا رہی ہو؟" کسی نے نیچے سے تیز لہجے میں اسے پکارا۔

سرخاب کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ سیکیورٹی گارڈ ارسلان تھا۔ یعنی اس نے کھانا کھانے کے لئے جانے کا بہانہ کیا تھا... اسے پھانسنے کے لئے۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ ایک تاریک کونے سے اسے کھڑکھڑ کی آواز سنائی دی تو اسے سوجھ گیا "بلیاں" اس نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ بہت بھوکی ہیں۔ مجھے جب بھی موقع ملتا ہے' میں ان کے لئے کچھ کھانے کو لے آتی ہوں" اس نے اپنے شاپنگ بیگ میں سے برگر کے کچھ ٹکڑے نکالے اور بلیوں کی طرف اچھال دیئے۔

ارسلان کا لہجہ کچھ نرم ہو گیا "بلیوں پر تو مجھے بھی ترس آتا ہے لیکن سرخاب' یہاں تمہارا کوئی کام نہیں" اس نے کہا پھر اس کی نظر زینے پر پڑی اور اٹھتی ہوئی سرخاب کے کمرے تک پہنچ گئی۔

سرخاب کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا راز کھل نہ جائے "آقائے ارسلان' آپ نے اپنے گھر میں بلی پالی ہے؟" اس نے جلدی سے پوچھا پھر وہ واپسی کے لئے چل دی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ارسلان یہاں زیادہ دیر ٹھہرے اور اس کے کمرے کو دیکھے۔

"نہیں۔ میری بیوی کو بلیاں اچھی نہیں لگتیں" ارسلان نے کہا اور چند لمحے ہچکچانے کے بعد اس کے پیچھے چلنے لگا۔

سرخاب پھر ویٹنگ روم میں چلی آئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب رات سے پہلے اپنے کمرے کا رخ نہیں کرے گی۔ اس وقت ارسلان چھٹی کر کے گھر جا چکا ہو گا۔

○

جلال جانتا تھا کہ شیریں تکلیف میں ہے۔ برے آدمی نے شاید اسے گرایا تھا.... دھکا دیا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا اتنی سختی سے ٹھنسا ہوا تھا کہ وہ بول نہیں سکتی تھی۔ لیکن وہ شیریں کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ بہت بہادر ہے۔ تبھی تو اس نے اس برے آدمی سے لڑنے کی ہمت کی ہے اور جب وہ ماما کو مار رہا تھا تو میں اتنا خوف زدہ تھا کہ مجھے اس سے لڑنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

شیریں آنٹی نے اس سے کہا تھا "اگر تم میرے منہ سے یہ سنو کہ میں تمہیں چھوڑ جاؤں گی تو ڈرنا مت۔ کیونکہ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔ اگر اس کی گن میرے ہاتھ میں آ جائے تو میں اسے مجبور کر سکتی ہوں کہ وہ ہمیں آزاد کر دے پھر میں جواد اصغر کو بچانے کی کوشش کروں گی۔"

جلال کی سمجھ میں شیریں کی بات آ گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ماما کو مارنے کے جرم میں جواد کو سزائے موت دی جا رہی تھی۔ جبکہ اس نے ماما کو نہیں مارا تھا لیکن جلال نے عدالت میں کہا تھا کہ اسی نے ماما کو مارا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور اس نے بابا جانی کو اپنے پیغام میں یہی بتانے کی کوشش کی تھی۔

اسے سردی لگ رہی تھی... اور اس کے ہاتھ پاؤں دکھ رہے تھے لیکن اندر کی تکلیف بہرحال ختم ہو گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ شیریں آنٹی یہاں سے نکلنے کی کوئی ترکیب ضرور نکال لیں گی۔ یا پھر بابا جانی آئیں گے اور انہیں بچا لیں گے۔

شیریں کی سانسیں اس کے رخسار کو چھو رہی تھیں۔ شیریں کے لمس سے اسے سکون مل رہا تھا۔ یہ ویسا سکون تھا۔ جو بچپن میں اسے اس وقت ملتا تھا' جب وہ سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتا اور گھبرا کر اٹھتا اور ماما اسے لپٹا لیتی تھیں "ڈرو مت۔ تم تو بہادر بچے ہو" وہ کہتی تھیں اور وہ ان سے لپٹ کر بے خوف نیند سو جاتا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ بابا جانی اور شیریں آنٹی اس کا بہت اچھی طرح خیال رکھیں گے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ شیریں آنٹی کو تسلی دے.... یہ کہ وہ اس کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ وہ اب ناک سے سانس لے گا... طویل سانس اور آہستہ آہستہ اور وہ اچھی باتیں سوچے گا۔ مثلاً اوپری منزل کا کمرا' جہاں وہ شیریں آنٹی کے بچپن کی ٹرینوں

سے کھیلے گا۔

مگر اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے وہ شیریں آنٹی سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

○

"خدا کے لئے نسرین' اب چھوڑو بھی۔ آدھی رات ہو گئی ہے۔" خالد نے بیوی سے کہا۔

نسرین نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔

"نہیں خالد۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے یاد آ جائے گا" نسرین نے کہا "میں ایک ایک دن کو الگ الگ یاد کرتی رہی ہوں لیکن شاید اب بھی میں نے کچھ مس کر دیا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ میں تمہیں بتاتی ہوں...."

خالد جانتا تھا کہ اصرار بے سود ہے۔ اس نے کرسی کھینچ کر بیڈ کے پاس رکھی اور اس پر بیٹھ گیا۔ اب اس کے لئے بھی ارتکاز ضروری تھا۔ حالانکہ اس کا سر دکھ رہا تھا۔ لیکن نسرین کا بے رنگ چہرہ اسے اپنی تکلیف سے بیگانہ کر رہا تھا۔ وہ دل میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ نسرین کو وہ بات یاد آ جائے' جس کے لئے وہ اتنی کوشش کر رہی ہے۔ وہ بہت خوف زدہ تھا اگر شیریں اور جلال کو کچھ ہو گیا اور نسرین کو بعد میں وہ اہم بات یاد آئی تو یہ صدمہ.... یہ بوجھ اسے بھی ختم کر دے گا۔

"خالد.... تم ہر روز کا گوشوارہ بناؤ" نسرین کے لہجے کا ٹھہراؤ حیران کن تھا "اس سے مجھے یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ میں کیا مس کر رہی ہوں۔ ایک پیڈ لے آؤ جلدی سے" خالد جا کر پیڈ لے آیا۔

"چلو.. اب ہم ہفتے کے دن سے شروع کرتے ہیں...." نسرین نے کہا۔

○

"گڈ لک آقائے آفندی" فیروز ہمدانی نے کمال سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ کمال نے تاوان کی رقم سے بھرا ہوا سوٹ کیس اٹھا لیا۔

"لک!" کمال نے حیرت سے دوہرایا "اس صورت حال میں مجھے اس لفظ کا خیال ہی نہیں آتا۔ یہ سب کچھ تو بیڈ لک کا نتیجہ ہے" جواب کا انتظار کئے بغیر وہ باہر نکل

گیا۔

فیروز اس کی کار کو باہر جاتے دیکھتا رہا۔ اسے کمال پر ترس آنے لگا۔ علامات بتا رہی تھیں کہ اوپر چڑھا ہوا خول چیخ رہا ہے۔ کمال ٹوٹ رہا تھا۔ علامتیں واضح تھیں۔ شیریں نے جو اس کی بیوی کی آواز کی نقل اتاری تھی' وہ شاید تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی تھی' اور کمال اصرار کرتا رہا تھا کہ وہ اس کی مرحومہ بیوی نازنین ہی کی آواز ہے۔ شیریں نے اغوا کی واردات کو نازنین کے قتل سے جوڑنے کی بے حد احمقانہ کوشش کی تھی۔

کئی باتیں تھیں جو فیروز ہمدانی کے اندازے کی تائید کر رہی تھیں۔ شیریں نے اپنے پیغام میں کمال سے معذرت کی تھی اور جلال نے کہا تھا کہ شیریں آنٹی اس کا خیال رکھ رہی ہیں۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ اغوا کی یہ واردات درحقیقت ڈراما ہے مگر یہ امکان اپنی جگہ تھا کہ وہ ایک سنگین واردات ہے۔ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

فیروز ہمدانی نے اپنا کوٹ اٹھایا۔ اسے امید تھی کہ آقائے اسفندیار اس کی مدد کر سکیں گے۔ وہ ابھی ان سے ہی ملنے جا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ مجرم کے بھیجے ہوئے کیسٹ کو سن کر کچھ اہم نتائج اخذ کر سکیں۔ وہ پولیس سے بیس سال پہلے ریٹائر ہوئے تھے پھر وہ بینائی سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد سے انہوں نے مسلسل مشق کر کے اپنی سماعت کو آنکھوں کا نعم البدل بنا لیا تھا۔ وہ آوازوں کی مدد سے ماحول کا اندازہ لگانے کے ماہر ہو گئے تھے اور بہت کچھ شناخت کر سکتے تھے۔

فیروز نے کمال سے نازنین کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ قم کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور وہیں پلی بڑھی تھی۔ وہ معلومات آقائے اسفندیار کے لئے اہم ثابت ہو سکتی تھیں۔ وہ بتا سکتے تھے کہ کیسٹ میں بعد کی آواز نازنین ہی کی ہے یا کسی اور کی ہے۔ جہاں تک فیروز ہمدانی کا تعلق ہے تو اسے یقین تھا کہ شیریں نے نازنین جیسی آواز بنانے کی کوشش کی ہے۔

○

برف باری اب بھی ہو رہی تھی لیکن کمال کو ڈرائیونگ کے دوران میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ پونے دو بجے وہ عقاب کے بتائے ہوئے فون بوتھ پر پہنچ گیا۔ وہاں

اس نے گاڑی کھڑی کر دی۔

ٹھیک دو بجے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ وہی گھٹی گھٹی آواز۔ اس بار اسے خیابان جمشید کے بوتھ نمبر 96 میں پہنچنے کی ہدایت دی گئی۔

وہ خیابان جمشید کی طرف چل دیا۔

سوا دو بجے اس نے بوتھ نمبر 96 میں عقاب کی کال ریسیو کی "تمہیں شاہراہ جمال پہنچنا ہے" اس گھٹی گھٹی آواز نے اسے ہدایت دی "وہاں تیسرے سنگ میل پر گاڑی پارک کرو اور ہیڈ لائٹس بجھا کر میرا انتظار کرو۔"

کمال دو بج کر چھتیس منٹ پر وہاں پہنچا۔ وہاں سڑک کے دوسری طرف ایک بڑی سیڈان کھڑی تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کمال نے اسٹیئرنگ تھوڑا سا موڑا۔ شاید چھپا ہوا کیمرا اس کار کی نمبر پلیٹ کی تصویر اتار لے۔

سڑک پر تاریکی تھی۔ اسٹریٹ لائٹس آدھی سے زیادہ بجھی ہوئی تھیں۔

کار کے اگلے دروازے کو کسی نے تھپتھپایا۔ کمال نے سر گھما کر دیکھا۔ اسے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔ دستانے میں چھپا ایک ہاتھ اسے کھڑکی کا شیشہ اتارنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ "میری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں آفندی" گھٹی گھٹی آواز' سخت لہجہ....

کمال کو گہرے رنگ کا کوٹ اور اس کا ماسک نظر آیا۔ کرکٹ کے کٹ بیگ جیسا ایک بیگ اس کی گود میں آ کر گرا۔ کمال کو اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی محسوس ہوئیں۔ وہ سوٹ کیس نہیں لے کر جا رہا تھا.... سوٹ کیس' جس میں الیکٹرونک ٹریسر چھپا تھا۔

"سوٹ کیس کھولو اور رقم اس بیگ میں بھر دو۔ جلدی کرو۔"

اس بار آواز میں اعصاب زدگی کی تمام علامتیں موجود تھیں۔ کمال نے سوٹ کیس کھولا اور رقم بیگ میں منتقل کرنے لگا۔

"بیگ بند کر کے میری طرف بڑھا دو۔ میری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔"

کمال سامنے کی طرف دیکھتا رہا "اور میرے بیٹے اور شیریں کا کیا ہو گا؟"

دستانے میں چھپا ہاتھ کار میں داخل ہوا اور بیگ لے کر باہر نکل گیا "میں اکیلا نہیں ہوں آفندی۔ تم پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ تمہیں پندرہ منٹ یہیں رکے رہنا ہے

اگر رقم پوری ہوئی اور میرا پیچھا نہیں کیا گیا تو میں تمہیں بتا دوں گا کہ تمہیں صبح ساڑھے گیارہ بجے اپنا بیٹا اور شیریں کہاں مل سکیں گے۔"

ساڑھے گیارہ بجے! کمال کو جھٹکا لگا۔ یہ ٹھیک وہی وقت تھا' جب جواد اصغر کو پھانسی دی جانی تھی "تم کسی اعتبار سے میری بیوی کے قتل میں بھی ملوث ہو؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ شاید مجرم رقم لے کر کھسک لیا تھا۔ سڑک کے پار کھڑی کار اسٹارٹ ہوئی۔ کمال نے گھڑی دیکھی۔ دو بج کر اڑتیس منٹ ہوئے تھے۔

دو بج کر ترپن منٹ پر کمال نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ تین بج کر دس منٹ پر وہ اسپیشل پولیس کے ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ اس کے پہنچتے ہی پولیس کے آدمی اس کی کار پر پل پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس کھول دیں۔ فیروز ہمدانی کمال کو اپنے کمرے میں لے گیا اور اس سے تفصیل سننے لگا۔ کمرے میں ایک اور شخص بھی تھا۔ اس کے بال سفید تھے اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشمہ لگا تھا۔ فیروز ہمدانی نے اس سے کمال کا تعارف کرایا۔

"میں نے آقائے اسفند یار کو وہ کیسٹ سنوایا ہے" فیروز نے کہا "آواز کی کوالٹی اور گونج کی مدد سے انہوں نے اندازہ قائم کیا ہے کہ جلال اور شیریں پاشا کو ایک ایسی جگہ رکھا گیا ہے' جو تقریباً خالی ہے۔ وہاں سردی بہت ہے.... اور اس کا سائز 23 x 11 فٹ کے لگ بھگ ہے۔ ٹرینوں کی آواز بتاتی ہے کہ قریب ہی کوئی فریٹ یارڈ بھی ہے۔"

"اور وہ جو آخری آواز ہے...." اسفند یار نے ہچکچاتے ہوئے کہا "یہ بتایئے' آپ کی بیوی کی مادری زبان ترکی تو نہیں تھی۔"

"جی نہیں۔ وہ نسلاً ایرانی تھی۔ ایک.... ایک منٹ.... ہاں.... میری بیوی نے ابتدائی تعلیم انقرہ میں حاصل کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ لڑکپن میں وہ فارسی کے بجائے ترکی زبان میں سوچتی تھی۔"

"تب آپ نے درست پہچانا ہے۔ وہ کوئی نقل نہیں۔ آپ کی بیوی ہی کی آواز ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں غلطی پر تھا" فیروز ہمدانی نے جلدی سے کہا "لیکن آقائے اسفند یار کہتے ہیں کہ وہ آواز جلال اور شیریں پاشا کی آوازوں کے بعد ریکارڈ کی گئی ہے۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ فیروز نے ریسیور اٹھایا "گڈ۔ کوشش میں لگے رہو" اس نے کچھ سننے کے بعد کہا اور ریسیور رکھ دیا پھر وہ کمال کی طرف مڑا۔ "دوسری گاڑی کی نمبرپلیٹ کی واضح تصویر ملی ہے۔ اب اسے ٹریس کیا جا رہا ہے۔"

اسفند یار نے کمال کی طرف ہاتھ بڑھایا "آقائے آفندی' میرا اندازہ ہے کہ آپ کی بیوی نے وہ جملہ دروازہ کھولتے وقت کہا تھا اور وہ دروازہ ایسا ہے کہ کھلتے ہوئے تھوڑا سا چرچراتا ہے.... ایسے...." اس نے حلق سے آواز نکال کر سمجھانے کی کوشش کی۔ "اس سے کچھ مدد مل سکتی ہے آپ کو؟"

کمال اور فیروز ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ کمال کو وہ مسخرا پن لگ رہا تھا۔ اب اس سے نازنین کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ فیروز نے اچانک کہا "جی ہاں آقائے اسفند یار۔ آقائے آفندی کے گھر کے کچن کا دروازہ اسی طرح کی چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا ہے۔"

○

شہباز بار سے چلا تھا تو کچھ فکر مند تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بار میں آفاق سے ضرور ملاقات ہو گی.... اور وہ اس سے کام کی معلومات اگلوائے گا لیکن آفاق کا موجود نہ ہونا اس بات کی دلیل تھا کہ کمال نے پولیس سے رابطہ قائم کیا ہے..... اسپیشل پولیس سے!

اور یہ جو اجنبی شخص بار میں آیا تھا' سوالات بہت کر رہا تھا۔ وہ یقینی طور پر اسپیشل پولیس کا آدمی تھا۔ اس نے اس کے سامنے تبریز کا حوالہ دے کر غلطی کی تھی۔ کیا حماقت ہے.... کاشان کوئی تبریز تو نہیں۔ میں واپس آؤں گا۔ کاشان کے قریب ہونے کا تذکرہ کرنے کے لئے تبریز کا حوالہ ضروری تو نہیں تھا۔ ممکن ہے' اس اشفاق حسین نے اسے اہمیت ہی نہ دی ہو۔

گاڑی چلاتے ہوئے پسینہ اس کے ہاتھوں سے پھوٹ نکلا۔ وہ بارہ برس پیچھے چلا گیا۔ اسپیشل پولیس والے اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے "اخبار والے کا کہنا ہے کہ

اس نے لڑکی کو تمہارے ساتھ دیکھا تھا۔ بتاؤ' لڑکی کہاں ہے؟"

"میں نے تو اس کا سامان باہر پہنچایا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کوئی اسے لینے کے لئے آئے گا۔"

پولیس کچھ ثابت نہیں کر پا رہی تھی لیکن سرتوڑ کوشش کر رہی تھی "اور دوسری لڑکیوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ذرا یہ تصویریں دیکھو۔ تم تو اسٹیشن پر ہی ہوتے ہو۔ ان میں کس کس کا سامان تم نے باہر پہنچایا؟"

وہ بچ نکلا لیکن اسے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ خطرے میں ہے۔ سو چھ سال پہلے وہ سمنان چلا آیا اور یہ گیراج کھول لیا۔

اور اب وہ اپنی گاڑی میں ائرپورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ رقم جس بیگ میں تھی' وہ اس کی کار میں موجود تھا۔ ذرا دیر بعد وہ ائرپورٹ کے پارکنگ لاٹ میں داخل ہوا۔ اس کا منصوبہ پر از ذہانت تھا۔ اس بار اس نے کار نہیں چرائی تھی۔ یہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کون جانے' کار کا مالک تین منٹ میں واپس آ جائے اور فوراً ہی کار چوری ہونے کی رپورٹ درج کرا دے۔ پتا چلے کہ آپ پانچ میل بھی نہیں گئے اور پولیس نے آپ کو دھر لیا۔ آدمی کار چرائے تو ایسے آدمی کی' جس کے جلد واپس نہ آنے کی ضمانت ہو.... مثلاً وہ فلم دیکھنے گیا ہو یا کوئی فلائٹ پکڑ رہا ہو۔

ائرپورٹ کی یہ کورڈ پارکنگ تھی۔ وہ گیارہ بج کر بیس منٹ پر اپنی گاڑی لے کر اندر داخل ہوا۔ اس نے مشین میں سکہ ڈال کر پارکنگ ٹکٹ حاصل کیا۔ پارکنگ کا آٹومیٹک گیٹ اوپر اٹھا اور وہ گاڑی اندر لے گیا۔ اس نے اپنی گاڑی کو دو بڑی گاڑیوں کے درمیان یوں کھڑا کیا کہ وہ نمایاں نہ رہے۔

وہ اپنی گاڑی کی سیٹ کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ پارکنگ کے لئے جو اگلی دو گاڑیاں آئیں' وہ مناسب نہیں لگیں۔ وہ کسی عام سی گاڑی کی تلاش میں تھا۔ اس کے لئے اسے چالیس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر وہ سیڈان اندر آئی۔ اس نے اسے منتخب کر لیا۔ سیڈان کا ڈرائیور گاڑی سے اترا۔ اس کے ہاتھ میں دو سوٹ کیس تھے۔ وہ یقینی طور پر شہر سے کہیں باہر جا رہا تھا۔

اس کے باہر نکلنے کے بعد شہباز اپنی گاڑی سے نکلا اور تیز قدم بڑھاتا سیڈان کی

طرف گیا۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر سیڈان کے دروازے میں لگایا۔ پہلی چابی سے بات نہیں بنی مگر اس کی آزمائی ہوئی دوسری چابی نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے اگنیشن کا سوئچ آن کیا۔ انجن فوراً ہی اسٹارٹ ہو گیا اور وہ تقریباً بے آواز تھا۔ ٹنکی بھی تقریباً فل تھی یہ ایک اور خوش آئند بات تھی۔

اس نے انجن کو بند کر دیا۔ یہاں سے جلدی گاڑی لے کر نکلنے کی صورت میں گارڈ کو شک ہو سکتا تھا مگر اس کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے پاس کافی وقت تھا۔ اس نے پچھلی سیٹ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے تصور میں نازنین آفندی کا چہرہ لہرا گیا۔ وہ پہلی رات....

وہ ہائی وے پر ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ ابھی پچھلی دو وارداتوں کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے مگر اس سنسان مقام پر اس بے حد حسین عورت کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی۔ کار کی ہیڈ لائٹس کے سامنے اس کا جسم اپنی تمام تر حشر خیزیوں کے ساتھ بے حد نمایاں تھا اور اس کے خوب صورت چھوٹے چھوٹے ہاتھ جیک سے الجھے ہوئے تھے۔

اس نے اپنی گاڑی اس کی کار کے پاس روکی تو اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ ان بڑی بڑی آنکھوں میں چوکنے پن کا تاثر تھا۔

"میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں مس؟ میں مکینک ہوں" اس نے کہا۔

نگاہوں کا چوکنا پن اور چہرے پر فکر مندی کا تاثر غائب ہو گیا "میں شکر گزار ہوں گی" وہ مسکرائی "کیسی غلط جگہ پر ٹائر پنکچر ہوا ہے۔"

"لائیے.... جیک مجھے دیجئے۔"

اس نے بڑی پھرتی سے ٹائر تبدیل کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا پیش کروں آپ کو؟" وہ سر جھکائے پرس کھول رہی تھی۔ شہباز اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بے حد شاداب جسم کی مالک تھی اور وہ عام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ اس کے انداز میں وقار تھا۔

شہباز نے اسے چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا....

اسی وقت وہ دونوں روشنی میں نہا گئے۔ شہباز نے خود کو سنبھالا وہ گشتی پولیس کی

کار تھی "دس تومان دے دیجئے..... ٹائر تبدیل کرنے کے" اس نے ہاتھ کھینچے بغیر کہا "اور آپ چاہیں تو میں پنکچر بھی لگا دوں گا۔ میرا نام شہباز اسدی ہے۔ سمنان میں رضا اسٹریٹ پر میری دکان ہے۔"

پولیس کار آ کر رکی۔ ایک پولیس والا جلدی سے باہر آیا۔ "مادام... آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے شہباز کو شک آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میری کار کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ آ گئے" نازنین نے کہا "یہ بھی سمنان میں رہتے ہیں۔"

شہباز کو اپنی خوش قسمتی پر رشک آ گیا۔ اس نے یہ بات ایسے کہی تھی' جیسے وہ شناسا ہوں۔ پولیس والے کے چہرے کا تاثر بدل گیا "آپ واقعی خوش قسمت ہیں مادام" اس نے کہا "آج کل ہائی وے پر اکیلی خاتون کا رات کو سفر کرنا خطرناک ہو گیا ہے۔"

پولیس والا گاڑی میں جا بیٹھا مگر ان دونوں کو دیکھتا رہا۔

"تو آپ پنکچر لگا دیجئے گا" نازنین نے اس سے کہا "میں نازنین آفندی ہوں۔ ہمارا گھر سرد اسٹریٹ پر ہے۔"

"جی.... مجھے خوشی ہو گی" وہ ٹائر اٹھا کر اپنی گاڑی کی طرف لے گیا اور اپنی ڈکی میں رکھ دیا پھر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ یہ تاثر دے رہا تھا کہ اب اس کا نازنین سے دوبارہ ملنے کا ارادہ نہیں اور نازنین نے جس انداز میں اسے دیکھا تھا' وہ صاف بتا رہا تھا کہ اسے پولیس کی مداخلت بے جا بھی لگی ہے۔ وہ اس پر مرمٹی تھی۔

اگلی صبح نازنین نے اسے فون کیا تھا "میرے شوہر نے ابھی ٹائر کے سلسلے میں مجھے خوب جھاڑا ہے۔" اس کے لہجے میں جذبات کی گرمی تھی "آپ یہ بتا دیں کہ میں ٹائر لینے کب آ جاؤں؟"

اس نے بہت تیزی سے سوچا۔ سرد اسٹریٹ پر سکون علاقہ تھا اگر وہ یہاں گیراج پر آئی تو قربت کا موقع تو نہیں مل سکتا۔ "دیکھئے..... اس وقت تو مجھے ایک کام سے جانا ہے اور آپ کیوں زحمت کرتی ہیں۔ پانچ بجے تک میں خود ٹائر آپ کے گھر پہنچا دوں گا" وہ جانتا تھا کہ پانچ بجے اندھیرا ہونے لگتا ہے۔

"یہ اور بھی اچھی بات ہے" وہ خوش ہو گئی "میں اپنے شوہر کو لینے اسٹیشن جاؤں گی تو وہ خوش ہو جائیں گے ٹائر دیکھ کر۔"

اس کے بعد شہباز سے کام نہیں کیا گیا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ اس نے نہا دھو کر کپڑے بدلے اور اپنے کیسٹ سنتا رہا پھر اس نے ایک سادہ کیسٹ پر نازنین کا لیبل لگایا اور اسے کیسٹ ریکارڈر میں لگا دیا پھر اس نے کیمرا چیک کیا۔ اس میں ریل موجود تھی۔

پانچ بج کر دس منٹ پر وہ دکان بند کر کے اپنی گاڑی میں سرد اسٹریٹ کی طرف چل دیا۔ گاڑی اس نے سڑک کے پیچھے والے جنگل میں کھڑی کر دی۔ ممکن ہے' کوئی گڑبڑ.....

وہ نازنین کے گھر پہنچا۔ اس کی کار باہر کھڑی تھی۔ چابی اگنیشن میں لگی تھی۔ کچن کی کھڑکی سے وہ نظر آ رہی تھی۔ وہ سودا سلف سلیقے سے رکھ رہی تھی۔ کچن میں بلب روشن تھا۔ اس روشنی میں نیلا سوئٹر پہنے وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ اس کے گلے میں اسکارف پڑا تھا۔

اس نے پھرتی سے کار کا ٹائر تبدیل کیا۔ اس دوران میں وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا مگر سڑک سنسان تھی۔ ٹائر تبدیل کرنے کے بعد اس نے جیب سے ٹیپ ریکارڈر نکال کر پلے کا بٹن دبایا اور نازنین کو مسرت سے ہمکنار کرنے کا اپنا منصوبہ ریکارڈ کرنے لگا پھر وہ گیا اور اس نے کچن کے باہر کھلنے والے دروازے پر دستک دی۔

نازنین بھاگ کر دروازے پر آئی اور اسے دیکھ کر چونکی۔ وہ متاسف ہوا کہ وہ اسے بھول گئی ہے.... پہچان ہی نہیں سکی۔ اس نے گاڑی کی چابیاں اس کے سامنے لہرائیں اور دروازے کے شیشے کے پار اسے مسکراہٹ سے نوازا۔

نازنین نے دروازہ کھول دیا۔ اس کا انداز دوستانہ تھا اور اس میں گرم جوشی تھی۔ اس نے اسے اندر آنے کو کہا۔ وہ اندر چلا گیا۔

"جی.... کیا دوں آپ کو؟" نازنین نے پوچھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور..... "مجھے ان سکوں میں ادائیگی کرو جانم" اس نے بے حد محبت سے کہا۔

اگلے ہی لمحے اس کی امیدوں کا محل زمین بوس ہو گیا۔ نازنین نے پوری قوت سے اس کے رخسار پر تھپڑ مارا "نکل جاؤ یہاں سے" اس نے نفرت سے کہا' جیسے وہ انسان نہیں' گندگی کا ڈھیر ہو۔ جیسے اس پر اس کا کوئی احسان ہی نہ ہو۔

ہمیشہ کی طرح وہ پاگل ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گلے میں پڑا اسکارف تھاما اور اسے بل دینے لگا۔ وہ اسے جھٹکے سے دھکیل کر ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی لیکن وہ مدد کے لئے بالکل نہیں چلائی۔ اس کا سبب اس کی سمجھ میں آیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ گھر میں بچے کی موجودگی کے متعلق جانے اور اس نے آتش دان کے قریب رکھا پوکر بھی اٹھا لیا تھا۔

وہ ہنسا۔ اس نے اس سے پوکر چھین کر پھر وہیں رکھ دیا جہاں سے نازنین نے اسے اٹھایا تھا پھر وہ دوبارہ اس کے اسکارف کو بل دینے لگا۔ اس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی اور اس کا چہرہ نیلا پڑتا جا رہا تھا۔

وہ اسے ایک ہاتھ سے پکڑے' دوسرے سے کیمرا تھامے اسی کی تصویریں کھینچ رہا تھا۔ اسی لمحے اسے عقب سے گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ زینے پر بچہ کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں.... وہ نگاہیں اس کے جسم میں اترتی جا رہی تھیں اور وہ لڑکا بالکل اسی طرح اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا' جیسے اس کی ماں لے رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ نازنین کو نہیں مار سکا ہے۔ اس کی روح اپنے بیٹے کے جسم میں منتقل ہو گئی ہے اور جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے.... انتقام کی دھمکی دے رہی ہے۔

وہ نازنین کو چھوڑ کر بچے کی طرف بڑھا۔ وہ سانسوں کی اس کھڑکھڑ کو موقوف کر دے گا۔ وہ ان آنکھوں کو بند کر دے گا۔ وہ لڑکے پر جھکا....

مگر اسی لمحے اطلاعی گھنٹی بجی۔ وہ تیزی سے کچن کی طرف لپکا اور اس کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ لمحوں میں وہ جنگل میں پہنچا۔ اپنی کار اسٹارٹ کی اور چند منٹ کے اندر اپنی دکان پر پہنچ گیا۔

ایک گھنٹے بعد وہ بار میں داخل ہوا۔ اس وقت تک قتل کی خبریں پھیل چکی

تھیں۔

وہ خوف زدہ تھا مگر پھر اسے پتا چلا کہ قاتل بھاگتے ہوئے آفندی کی ایک پڑوسن سے ٹکرایا تھا۔ پڑوسن نے اسے جواد اصغر کی حیثیت سے شناخت کیا تھا۔ جواد اصغر ایک لڑکا تھا' جسے واردات سے ذرا پہلے نازنین آفندی سے بات کرتے دیکھا گیا تھا۔

پھر جواد اصغر گرفتار ہو گیا اور نازنین کے بیٹے نے اسے شناخت بھی کر لیا۔ واہ رے خوش قسمتی۔ جب وہ کچن سے نازنین کے پیچھے بھاگا تھا تو اس نے درمیانی دروازہ بند کر دیا تھا اس لئے ڈرائنگ روم میں اندھیرا تھا۔ بچہ اسے پہچان نہیں سکا اور گھنٹی کی آواز سن کر وہ بھاگا تو درمیانی دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں اس کی وجہ سے روشنی ہو گئی تھی.... اور بچے نے بعد میں آنے والے جواد اصغر کو دیکھ اور پہچان لیا تھا۔

مگر وہ بچے کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے قریب چلا گیا اور اس پر جھک گیا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بچے نے اسے نہ دیکھا ہو۔ شاید وہ شاک کی حالت میں ہو اور ممکن ہے' کسی دن اسے سب کچھ یاد آ جائے۔ اس بچے کی آنکھیں اسے خوابوں میں ڈراتی تھیں۔

اس کے بعد طویل عرصے تک اسے لڑکیوں کے بارے میں سوچنے کا بھی خیال نہیں آیا۔ یہاں تک کہ گزشتہ ماہ سی بی ریڈیو کا وہ پیغام اسے اس حسینہ کی طرف کھینچ کر لے گیا۔ اس کے دو ہفتے بعد اس نے دوسری واردات بھی کر دی۔

ان دو وارداتوں کے بعد وہ نازنین کو ہر روز خوابوں میں دیکھنے لگا تھا پھر دو ہفتے پہلے ایک روز آفاق اس سے ملنے کے لئے اس کی دکان پر آیا تو بچہ اس کے ساتھ تھا۔ بچہ اسے گھورتا رہا اسی لئے تو اس نے اسے بھی ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بچہ کسی بھی وقت اسے پہچان سکتا تھا پھر بار میں آفاق کے ذریعے اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے نام کا ٹرسٹ فنڈ بھی ہے تو فیصلہ کرنا اور آسان ہو گیا۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام....

وہ جب بھی نازنین کے بارے میں سوچتا' اسے کمال آفندی سے نفرت محسوس ہوتی۔ کمال آفندی' نازنین کو روز چھوتا ہو گا اور وہ اسے تھپڑ بھی نہیں مارتی ہو گی۔ صرف اس لئے کہ آفندی بڑا آدمی تھا۔ ایڈیٹر تھا۔ اس کی اہمیت تھی اور اب اسے

شیریں جیسی محبوبہ بھی مل گئی تھی مگر کوئی بات نہیں۔ اب وہ کمال آفندی کو دکھا دے گا کہ وہ اس سے بھی بڑی چیز ہے۔

اس کا منصوبہ بے حد خاص تھا۔ شیریں اور جلال کو عین اس لمحے مرنا تھا' جب جواد اصغر کو پھانسی ہونا تھی۔ یعنی شیریں اور جلال بھی سزائے موت پا رہے تھے اور انہیں.... سزائے موت وہ دے رہا تھا۔ کاش شیریں نہ مرتی..... کاش وہ اس سے محبت کرتی.... وہ اسے زندہ رکھتا۔

اور اب جب بم کا دھماکا ہوگا تو.... کتنے لوگ ملبے میں دبیں گے۔ تب انہیں پتا چلے گا کہ پھنسنا کیا ہوتا ہے جبکہ وہ آزاد ہوگا۔

وہ چونکا اسے یہاں کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا....

پونے دو بجے وہ پارکنگ سے نکلا۔ ٹھیک دو بجے اس نے ایک پبلک فون سے کمال آفندی سے طے شدہ فون بوتھ میں بات کی۔ اس نے اسے اس مقام پر بلا لیا جو اس نے بہت سوچ سمجھ کر منتخب کیا تھا۔

دو بج کر پچیس منٹ پر وہ وہاں پہنچا۔ وہ مناسب ترین جگہ تھی۔ وہاں سے ائرپورٹ تک چھ منٹ کا راستہ تھا اگر آفندی اپنے ساتھ پولیس کو لے بھی آتا تو وہ بہ آسانی نکل سکتا تھا۔

اس نے کار ایک طرف روکی اور خود مارکیٹ کے باہر ایک ستون کے پیچھے دبک کر کھڑا ہو گیا۔ دو بج کر چھتیس منٹ پر ایک کار کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ اس نے جلدی سے چہرے پر..... ماسک چڑھا لیا۔ اگلے ہی لمحے آفندی کی کار اس کی گاڑی کے پاس سے گزری۔ اسی لمحے کار ڈولی۔ شاید آفندی کی کار میں کیمرے چھپے تھے اور وہ اس کی کار کی نمبر پلیٹ کی تصویر لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ہنس دیا۔ اس تصویر سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

آفندی کی کار ٹھہر گئی۔ اس کے پیچھے بظاہر تو کوئی کار نہیں تھی۔ شہباز نے وہی بیگ سنبھالا' جس میں جلال کو بند کر کے لے گیا تھا۔ اب وہ اس بیگ میں رقم لے کر جائے گا کیونکہ آفندی جس سوٹ کیس میں رقم لایا ہو گا' ممکن ہے اس میں الیکٹرونک ٹرانسمیٹر چھپایا گیا ہو۔

وہ بہت تیزی سے..... لیکن بے آواز حرکت میں آیا۔ کمال آفندی کو اس کے پہنچنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس نے شیشے کو تھپتھپایا تو وہ چونکا۔ اس نے شیشہ اتارا۔ شہباز نے بیگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اسی مخصوص سرگوشی میں اسے ہدایات دیں۔

کمال نے خاموشی سے تعمیل کی۔ اس دوران میں شہباز چاروں طرف دیکھتا رہا مگر ادھر ادھر کہیں پولیس نظر نہیں آئی۔ ہر طرف سکوت تھا پھر اس نے کمال کو دیکھا۔ جو سوٹ کیس سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر بیگ میں منتقل کر رہا تھا۔

کمال آفندی نے رقم بیگ میں بھری اور بیگ اس کی طرف بڑھا دیا "تم کسی اعتبار سے میری بیوی کے قتل میں ملوث ہو؟"

اس سوال نے شہباز کو چونکا' گڑبڑا دیا 'یہ کیا..... کیا وہ شکوک کی زد میں آ رہا ہے؟ یہاں سے جلد از جلد نکل لینا چاہیے۔' سردی کے باوجود اس کا جسم پسینہ اگلنے لگا تھا۔ اس نے کوئی جواب دیئے بغیر تیزی سے سڑک پار کی' گاڑی میں بیٹھا اور تیزی سے ڈرائیو کرنے لگا۔

دو بج کر چھیالیس منٹ پر وہ ائرپورٹ پہنچ گیا۔ اس نے سیڈان وہیں چھوڑ دی' جہاں سے لی تھی۔ کار لاک کر کے وہ اپنی کار کی طرف بڑھا۔ اپنی فوکسی میں بیٹھ کر اس نے بیگ کھولا اور اس کا جائزہ لیا۔ ذرا دیر میں اس نے رقم گن لی۔ وہ پورے تین لاکھ اٹھائیس ہزار تومان تھے۔ اس نے کار کی عقبی سیٹ پر رکھا ہوا خالی سوٹ کیس اٹھایا اور نوٹوں کی گڈیاں اس میں سلیقے سے رکھ دیں۔ فلائٹ میں وہ سوٹ کیس اسے اپنے پاس رکھنا تھا۔

صبح سات بجے وہ گاڑی پارکنگ سے باہر لایا اور ٹریفک کے ریلے میں شامل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوٹل میں گرم پانی سے نہا رہا تھا۔

صبح چار بجے تک انہیں اندازہ ہونے لگا کہ نمبر پلیٹ والا واحد سراغ کسی کام کا ثابت نہیں ہو گا۔ اس سیڈان کا مالک بہزاد نظیر تھا جو رائل پیٹرولم کمپنی کا بہت بڑا عہدے دار تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ایسا آدمی اس طرح کی واردات تو نہیں کر سکتا۔ مزید تفتیش پر پتا چلا کہ آقائے بہزاد کسی سرکاری کام سے دو دن کے لئے تہران سے باہر گئے ہیں۔

پانچ بجے فیروز ہمدانی اور کمال سمنان کے لئے روانہ ہوئے۔ فیروز ڈرائیو کر رہا تھا

"کار کا کچھ پتا چلا؟" کمال نے اس سے پوچھا۔

"ابھی تو پتا نہیں چلا مگر میں جانتا ہوں کہ کیا پتا چلے گا۔ یہی کہ مجرم نے وہ کار چرائی تھی۔"

"تو اب کیا ہو گا؟"

"انتظار۔ ممکن ہے' وہ انہیں چھوڑ دے۔ اب اسے رقم تو مل گئی ہے نا۔"

اب تک اس نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا ہے۔ ایسے چالاک مجرم سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ ایسے افراد کو چھوڑ دے گا جو اسے پہچان سکتے ہیں۔ کیا تمہیں یہ توقع ہے؟" کمال کے لہجے میں تشویش تھی۔

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر اس نے انہیں نہیں چھوڑا تو ہمیں یہ خبر میڈیا کو دینی پڑے گی۔"

کمال ونڈ شیلڈ کے پار سڑک کو گھور رہا تھا۔ "پبلسٹی کے نتیجے میں مجرم خوف زدہ بھی ہو سکتا ہے؟"

"یہ عین ممکن ہے۔" فیروز نے سرد لہجے میں کہا "آپ کے ذہن میں کیا ہے آقائے آفندی۔"

سوال سیدھا تھا' براہ راست پوچھا گیا تھا۔ کمال کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔

جو اس کے ذہن میں تھا' وہ محض قیاس تھا۔ اس کا اظہار شیریں اور جلال کی زندگی کے لئے مہلک بھی ثابت ہو سکتا تھا پھر اسے خیال آیا.... یاد آیا کہ مقدمے کی کارروائی کے دوران میں جواد اصغر نے کہا تھا "میں نے قتل نہیں کیا۔ میں وہاں پہنچا تو وہ قتل ہو چکی تھی...."

"فیروز' آپ کو یاد ہے۔ فرید صادق نے کہا تھا کہ ان چار عورتوں کا قاتل وہی ہے جس نے نازنین کو قتل کیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ چار عورتیں اپنی کار میں ہلاک کی گئیں جب کہ نازنین کو اس کے گھر میں قتل کیا گیا۔"

"مجھے یاد ہے۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں آقائے آفندی؟"

"قتل سے ایک روز پہلے نازنین کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوا تھا۔ اس صبح وہ مجھے اسٹیشن پہنچانے آئی تو میں نے دیکھا کہ گاڑی اسپیئر وہیل پر چل رہی ہے اور فرید صادق جو جواد اصغر کا بیان چھوڑ کر گیا ہے' میں اسے پڑھ رہا تھا۔ جواد کہتا ہے کہ نازنین نے گھر کا پورا سودا ڈکی میں سمانے کی بات کی تھی۔"

"تو پھر"

"کار کی ڈکی چھوٹی تھی۔ اگر ڈکی میں سامان رکھنے کی جگہ تھی تو اس کا مطلب ہے کہ اسپیئر وہیل ڈکی میں نہیں رکھا گیا تھا اور یہ چار بجے کی بات ہے۔ نازنین سیدھی گھر گئی ہو گی کیونکہ گھر میں سائرہ صفائی کے لئے آئی ہوئی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ نازنین پانچ بجنے میں چند منٹ پر گھر واپس آئی تھیں۔ سائرہ فوراً ہی چلی گئی تھی۔ جلال ٹرینوں سے کھیلنے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نازنین نے ڈکی سے سودا نکالا اور کچن میں سلیقے سے رکھنے لگی۔ اب یہ طے ہے کہ اگلے چند منٹوں میں وہ قتل کر دی گئی۔ اس رات میں نے اس کی کار کی ڈکی کھولی تو اسپیئر وہیل اس میں موجود تھا۔ گاڑی میں مرمت شدہ ٹائر لگا ہوا تھا۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کسی نے ٹائر تبدیل کیا' اسپیئر وھیل ڈکی میں رکھا اور پھر آپ کی بیوی کو قتل کر دیا؟"

"صورت حال صاف اور واضح ہے۔ اسپیئر وہیل چار بجے ڈکی میں نہیں تھا۔ تبھی تو پورا سودا اس میں سما سکا اور اسپیئر وھیل نازنین کے قتل کے بعد ڈکی میں نہیں رکھا

جا سکتا تھا۔ یہ کام نازنین کے گھر واپسی اور اس کے قتل کے درمیان کسی وقت کیا گیا اور اس میں محض چند منٹوں کا درمیانی فاصلہ ہے۔" کمال نے کہا "اور اگر یہ حقیقت ہے تو جواد اصغر بے قصور ہے۔ اس سے پوچھو کہ سودا ڈکی میں رکھتے وقت اسے اسپئیر وہیل نظر آیا تھا یا نہیں۔"

ایکسی لریٹر پر فیروز کے پاؤں کا دباؤ بڑھ گیا۔ اسپیڈو میٹر کی سوئی 80 پر پہنچ گئی۔

کمال کے گھر پہنچتے ہی فیروز فون کی طرف جھپٹا۔ اس نے جیل کا نمبر ملایا اور وارڈن کو یہ سب کچھ بتایا "میں ہولڈ کئے ہوئے ہوں۔" اس نے کہا اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کمال سے کہا "وہ پھانسی کے انتظامات مکمل کر رہے ہیں۔"

"میرے خدا....!"

فیروز فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے ماؤتھ پیس پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا پھر وہ سنتا رہا۔ اس کے بعد اس نے شکریہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا "جواد اصغر کہتا ہے کہ سامان ڈکی میں رکھتے وقت اس نے ڈکی کو بالکل خالی پایا۔ اسپئیر وھیل وہاں موجود نہیں تھا۔"

"گورنر کو فون کرو.... خدا کے لئے.... ان سے کہو کہ سزا پر عمل درآمد چند گھنٹوں کے لئے ہی روک دیں۔"

فیروز ہمدانی گورنر ہاؤس کا نمبر ملا رہا تھا۔ اس نے کمال سے کہا۔ "یہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کی بنا پر وہ سزا کو روکیں گے۔"

لیکن گورنر سے بات نہیں ہو سکی۔ انہوں نے ہدایت کی تھی کہ سزائے موت کے التوا کے سلسلے میں ہر فون کال اٹارنی جنرل کو منتقل کر دی جائے اور اٹارنی جنرل سے رابطہ آٹھ بجنے سے پہلے ممکن نہیں تھا۔ کمال دل میں دعا کر رہا تھا ...'اے اللہ' یہ تینوں ہی کم عمر ہیں۔ انہیں زندگی بخش دے۔'

سات بج کر پینتیس منٹ پر فرید صادق آ دھمکا۔ "یہ تم جواد سے اسپئیر وھیل کے بارے میں کیوں پوچھ رہے تھے؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

فیروز نے سوالیہ نظروں سے کمال کو دیکھا۔ کمال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ فیروز صادق کو سب کچھ سنا ڈالا۔

فرید صادق کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "یعنی شیریں پاشا اور جلال آفندی اغوا کر لئے گئے اور تم یہ بات چھپائے بیٹھے ہو۔" اس نے تند لہجے میں کہا "یہ اطلاع گورنر کو ملتی تو وہ جواد کی سزائے موت ملتوی کر دیتے.... چلو اب تو کچھ کرو۔"

آٹھ بجے فیروز نے اٹارنی جنرل کے دفتر کا نمبر ملایا۔ وہ 35 منٹ تک بات کرتا رہا۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ وہ وضاحتیں کر رہا تھا لیکن رابطہ منقطع ہونے پر اس کے کندھے جھک گئے۔ "وہ سزا ملتوی نہیں کریں گے۔" اس نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

○

درد وجود کی دیوار و در سے پھوٹتا.... وجود میں دوڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے میں سوچنا بہت مشکل تھا۔ اس کا ٹخنا ابھی تک سنسنا رہا تھا۔ تکلیف شدید تھی۔ اس نے اپنی کراہ کا گلا گھونٹنے کی نیم کامیاب کوشش کی۔

اس نے جلال کو اپنے قریب کھسکتا محسوس کیا پھر وہ اسے دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنے باپ کی طرح تھا۔ بڑا ہو کر وہ بالکل کمال جیسا ہو گا۔ بشرطیکہ اسے بڑا ہونے کا موقع ملا.... زندگی ملی۔ اسے جلال کو یہاں سے نکالنا ہے۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی....

لیکن ارتکاز ناممکن تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں ادھر سے ادھر بھٹک رہی تھی۔ وقت گزرا جا رہا تھا۔ یہ بھی مسئلہ تھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکتی تھی کہ یہ دن ہے یا رات۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ ٹرینوں کے گزرنے کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی۔

'کمال ہمیں آ کر بچا لو۔' اس نے اپنی سوچوں میں کہا۔ سوچوں میں ہی جواب ملا۔ 'میں تم سے محبت کرتا ہوں شیریں۔ میں تمہیں بہت مس کرتا رہا ہوں۔' بڑے بڑے ہاتھ اس کے چہرے کو چھو رہے تھے۔ بڑے بڑے مہربان ہاتھ....

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عقاب اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ بڑے بڑے ہاتھ نرمی سے اس کے چہرے پر حرکت کر رہے تھے مگر وہ نرمی اسے بہت خوفناک لگ رہی تھی۔ وہ ہاتھ اس کی گردن تک پہنچے پھر اس نے اس کے منہ سے ڈھاٹا نکالا اور....

شیریں نے منہ موڑنے کی کوشش کی "سب کچھ نمٹ گیا شیریں۔ مجھے رقم مل گئی۔" وہ بولا۔

شیریں کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں۔ وہ اس کی دہکتی آنکھوں کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی "تم نے جلال کی ماں کو قتل کیا تھا۔ تم ہم دونوں کو قتل کر دو گے۔ ہے نا؟"

"تم ٹھیک سمجھی ہو شیریں۔ ارے ہاں، میں تو بھول ہی گیا۔" وہ کوئی چیز کھولنے لگا "اسے دوسری تصویروں کے ساتھ لگانا ہے۔"

شیریں نے اس تصویر کو دیکھا۔ جلال جیسی وہ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں اور وہ آنکھیں اس بکھرے ہوئے وجود کا حصہ تھیں۔ اس کی گردن میں اسکارف کسا ہوا تھا۔ تصویر کو دیکھ کر اس کے حلق میں ایک چیخ مچلی۔ اس نے بڑی مشکل سے اس کا گلا گھونٹا۔

وہ اس تصویر کو دوسری تصویروں کے برابر دیوار پر چسپاں کر رہا تھا۔ یہ تصویر بھی دوسری تصویروں جیسی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ یہی سوچ سکتی تھی کہ کیا یہ شخص ہمیں بھی گلا گھونٹ کر ختم کرے گا۔

"اب میں تمہارے لئے گھڑی سیٹ کر رہا ہوں۔" اس نے کہا "یہ بم ساڑھے گیارہ بجے پھٹے گا۔ تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ کچھ پتا بھی نہیں چلے گا۔ تم دونوں بھی جواد اصغر کے ساتھ ہی مرو گے.... ایک ہی وقت پر۔"

اس نے سوٹ کیس کھول کر اس میں سے گھڑی نکالی اور ٹائم سیٹ کیا۔ اب شیریں کو پتا چلا کہ اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں اور الارم ساڑھے گیارہ بجے کا تھا۔ وہ بم سے نکلی ہوئی تار گھڑی سے منسلک کر رہا تھا۔ بم پھٹنے میں تین گھنٹے باقی تھے۔

"میں جا رہا ہوں شیریں۔ تمہیں کچھ چاہئے تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"می.... مم.... مجھے باتھ روم جانا ہے۔"

"کیوں نہیں۔" وہ آیا۔ اس نے شیریں کے ہاتھ کھولے اور اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔

باتھ روم میں شیریں دروازے کی ناب پر زور آزمائی کرتی رہی۔ بالآخر ہینڈل ٹوٹ

کر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے اسے ٹٹولا۔ جہاں سے ہینڈل ٹوٹا تھا، وہاں خاصی تیز دھار تھی اس کی مگر اتنی بھی نہیں کہ کوئی بڑا فائدہ پہنچا سکتی۔ اس نے اسے جیب میں رکھا اور چٹخنی گرا دی۔

شہباز نے اسے لا کر پلنگ پر پٹخا اور اس کے ہاتھ باندھنے لگا۔ شیریں نے اس بار دونوں ہاتھوں کے درمیان فاصلہ رکھنے کی کوشش کی۔ تاکہ بندشیں قدرے ڈھیلی ہوں۔ شہباز نے اس کے منہ میں دوبارہ کپڑا ٹھونس دیا۔ وہ اس پر جھکا "ہم ایک دوسرے سے بہت محبت کر سکتے تھے شیریں۔"

شیریں خاموش رہی۔ شہباز نے جلال کی آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ بچے نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ اندھیرے کی عادی آنکھیں روشنی میں چندھیا گئی تھیں۔ شہباز اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا پھر اس کی نگاہ تصویروں کی طرف اٹھی۔ وہ اٹھا، اس نے لائٹ آف کی اور کمرے سے نکل گیا۔

شیریں گھڑی کی چمکتی ہوئی سوئیوں کو دیکھ رہی تھی۔ آٹھ بج کر چھتیس منٹ....!

○

نسرین یزدانی کے بستر پر کاغذ ہی کاغذ بکھرے ہوئے تھے!

"نہیں....چودہ تاریخ کو میں سیدھا ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی۔ میں لائبریری میں رکی تھی۔ یہ نوٹ کر لو خالد..."

وہ اس مہینے کی ہر مصروفیت یاد کر کے لکھوا رہی تھی لیکن ابھی تک عقاب سے متعلق کوئی یاد نہیں ابھری تھی۔ صبح کے چار بجے خالد نے کہا "ہم اتنا تھک چکے ہیں کہ سوچنا اور یاد کرنا آسان نہیں ہے۔ کچھ دیر سو لیا جائے۔ میں سات بجے کا الارم لگا رہا ہوں۔"

سات بجے اٹھ کر خالد نے چائے بنائی۔ نسرین نے نائٹرو گلیسرین کی ایک ٹیبلٹ حلق سے اتاری اور کاغذ قلم سنبھال لیا۔

نو بجے عائشہ کام کرنے کے لئے آ گئی۔ سوا نو بجے وہ اوپر آئی۔ "بیگم صاحبہ، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نیچے کی صفائی کر لیتی ہوں۔"

"یہ ٹھیک ہے عائشہ۔ شکریہ۔"

"میں خوش ہوں۔ بیگم صاحبہ کہ میں وعدے کے مطابق پہنچ گئی۔ ورنہ اس کار کی چوری نے تو..."

"ہاں۔ خالد نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری کار چوری ہو گئی تھی۔"

"مجھے دکھ اس کا تھا کہ ہم نے کار کی مرمت پر بڑی رقم خرچ کی تھی۔ گاڑی کی صورت نکل آئی تھی۔ شہباز مکینک ہی اتنا اچھا ہے۔ اس نے طبیعت سے کام کیا تھا اس پر۔ خیر.... خدا کا کرم ہے کہ گاڑی واپس مل گئی۔ آپ شاید مصروف ہیں۔ میں نیچے صفائی کرنے جاتی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ ایک منٹ بعد خالد آ گیا۔ نسرین نے پلے کا بٹن دبایا۔ وہی جملہ جو اب تک وہ سینکڑوں بار سن چکی تھی' پھر سنائی دیا۔ اس نے اسٹاپ کا بٹن دبا دیا "خالد.... تمہیں یاد ہے' ہم نے کار کی سروس کب کرائی تھی؟" اس نے اچانک ہی شوہر سے پوچھا۔

"ایک ماہ سے اوپر ہو گیا۔ آفاق نے اس مکینک کی سفارش کی تھی۔" خالد نے کہا۔

"ہاں اور تم نے مجھے وہاں ڈراپ کیا تھا کہ میں کار لے آؤں۔ شہباز نام ہے اس مکینک کا۔ ارے.... خالد.... میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ جلال اور شیریں کو اس مکینک شہباز نے اغوا کیا ہے۔" نسرین کے لہجے میں سنسنی تھی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئے "سو فی صد۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" خالد نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ یہ آواز میں نے سنی ہے۔ اب مجھے یاد آ گیا اور پھر شہباز اور عقاب...."

اس وقت ساڑھے نو بجے تھے!

○

سرخاب پوری رات سو نہیں سکی۔ اس کی طبیعت خراب تھی۔ اس کا بس چلتا تو اپنے کمرے میں جاتی اور سکون سے اپنے پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتی۔ یہ اس کے لئے ضروری تھا۔

صبح آٹھ بج کر چالیس منٹ پر وہ مسافروں میں گھل مل کر نیچے پہنچی۔ اب اسے اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ وہ شخص موجود ہو گا۔ وہ ہر خطرہ مول لینے کے لئے تیار تھی۔

وہ سیڑھی کے پاس پہنچی۔ اسی لمحے اسے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ جنریٹر کی اوٹ میں دبک گئی۔ وہ مرد زینے سے اتر کر رکا' اس نے ادھر ادھر دیکھا اور سن گن لیتا رہا پھر وہ پھسلواں راستے کی طرف چل دیا۔

سرخاب نے سکون کی سانس لی۔ یہ بلا تو ٹلی۔ لڑکی کو وہ ڈرا دھمکا کر بھگا دے گی۔ اس نے کوٹ کی جیب میں سے ٹٹول کر کمرے کی چابی نکالی مگر ہاتھوں میں لرزش کی وجہ سے چابی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے سانسیں روک لیں۔ کیا یہ آواز جاتے ہوئے مداخلت کار نے سنی ہو گی لیکن اسے واپس آتے ہوئے قدموں کی چاپ نہیں سنائی دی تھی۔ پھر بھی وہ دس منٹ تک سانس روکے کھڑی رہی۔ اُس کا دل یوں دھڑک رہا تھا' جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔

دس منٹ بعد وہ آہستہ آہستہ جھکی۔ اندھیرا بہت تھا۔ وہ ٹٹول کر چابی کو تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ بالآخر اس کا ہاتھ چابی سے ٹکرایا۔ اس نے سکون کی سانس لی۔

وہ چابی پکڑ کر سیدھی کھڑی ہو رہی تھی کہ کوئی سرد دھار دار چیز اس کی پشت پر ٹکی۔ اس نے سانس روک لی۔ اگلے ہی لمحے وہ دھار دار چیز اس کی پشت میں اتنی سرعت سے اتری کہ اسے تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جسم سے گرم گرم خون نکلنے کا احساس ہوا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اور آگے کی طرف گرتی چلی گئی۔ دھیرے دھیرے وہ بے ہوشی کے غار میں اترتی چلی گئی۔ کمرے کی چابی اب بھی اس کی مٹھی میں دبی تھی۔

○

ساڑھے نو بجے ہیڈ کوارٹر سے کمال آفندی کے گھر فون آیا' جو فیروز ہمدانی نے ریسیو کیا "بات کچھ بن رہی ہے سر۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"تفصیل سے بات کرو۔" فیروز نے چڑچڑے پن سے کہا۔

"وہ بار والا مکینک شہباز بارہ سال پہلے سینٹرل اسٹیشن سے گرفتار کیا گیا تھا۔ کچھ لڑکیوں کی گمشدگی کے سلسلے میں اس پر شبہ کیا جا رہا تھا۔ آپ نے جو حلیہ لکھوایا ہے' وہ اس پر پورا اترتا ہے۔"

"بہت خوب۔ اس کے متعلق اور چھان بین کی تم نے؟"

"ہم چیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کہاں رہتا رہا ہے۔ اس نے بے شمار چھوٹے موٹے کام کئے ہیں۔ پیٹرول پمپ پر کام کرتا رہا ہے۔ سینٹرل ریلوے اسٹیشن کے روشن ریستوران میں وہ ڈش واشنگ کرتا رہا ہے...."

"اس کی رہائش گاہ کا پتا کرو۔ اس کی فیملی بھی ہو گی۔ یہ سب معلوم کرو۔" فیروز نے ریسیور رکھ دیا "آقائے آفندی۔" اس نے کمال سے کہا "بات کچھ بن رہی ہے۔ یہ مکینک بار میں آتا جاتا رہا ہے' جہاں آفاق جاتا ہے۔"

"مکینک!" کمال کی آواز بلند ہو گئی پھر اس نے دہرایا "مکینک!"

"جی ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ ممکن تو ہے کہ کسی نے اس روز آپ کی بیگم صاحبہ کی کار کا ٹائر کا پنکچر لگایا ہو۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف خالد یزدانی تھا۔ "نسرین کا دعویٰ ہے کہ اس نے آواز پہچان لی ہے۔ اس کے خیال میں شہباز مکینک نے جلال اور شیریں کو اغوا کیا ہے۔"

فیروز نے رابطہ منقطع کیا۔ وہ ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملانے والا تھا کہ دوبارہ گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ "وہاٹ؟" وہ چلایا پھر وہ پیڈ پر لکھنے لگا۔

"رقم کا شکریہ۔ تم نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اب میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ جلال اور شیریں زندہ ہیں لیکن ساڑھے گیارہ بجے وہ بم دھماکے میں ختم ہو جائیں گے۔ دھماکا تہران میں ہو گا۔ ملبے میں سے تم ان کی لاشیں نکال سکتے ہو۔ عقاب!

کمال پیڈ پر لکھے نوٹ کو گھور رہا تھا۔ "یہ پیغام کس نے نوٹ کیا ہے؟"

"درگاہ کے مجاور نے۔" فیروز نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

اس وقت نو بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے!

○

شہباز کا جسم پسینے میں نہا گیا۔ اگر بڑھیا کے ہاتھ سے چابی نہ گرتی.... آواز نہ ہوتی تو اسے پتا بھی نہ چلتا۔ اب وہ سمجھا کہ اس عورت نے ہی پلنگ اس کمرے میں پہنچایا ہو گا۔ اگر وہ کمرے میں پہنچ جاتی اور ان دونوں کو دیکھ لیتی تو پولیس کو مطلع کر دیتی اور بم اسکواڈ کو اتنی مہلت مل جاتی کہ وہ سکون سے بم کو ناکارہ بنا کر انہیں بچا لیتے۔

وہ اسٹیشن سے نکل کر ہوٹل پہنچا۔ وہاں اس نے اپنی گاڑی نکالی اور سیدھا ائرپورٹ کے لئے روانہ ہو گیا۔ تبریز کی فلائٹ کو ساڑھے دس بجے روانہ ہونا تھا۔

اس نے گاڑی اسی پارکنگ میں کھڑی کی' جہاں سے وہ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی گاڑی لے کر نکلا تھا۔ اس نے دونوں سوٹ کیس نکالے اور بس اسٹاپ پر پہنچا۔ وہاں سے ائر پورٹ جانے والی بس میں بیٹھا۔ دوسرے مسافروں نے اسے دیکھا ضرور مگر بے تعلقی سے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کتنا ذہین' چالاک اور دولت مند ہے۔

اس نے سامان کا سوٹ کیس لگیج میں رکھوایا اور رقم کا سوٹ کیس اپنے پاس رکھا۔ پھر اس نے فلائٹ کا ٹکٹ پیش کیا' ٹکٹ پر اس کا نام میرباز بلوچ تھا۔

ٹرمینل میں داخل ہونے کے بعد اس نے ایک فون کال کی پھر وہ ناشتے کی غرض سے کیفے ٹیریا میں چلا گیا۔ اب اس کے اعصاب پرسکون ہوتے جا رہے تھے۔ علی میاں کی درگاہ فون کر کے وہ خوش بھی ہوا تھا اور اس سے اس کی خود اعتمادی میں اضافہ بھی ہوا تھا۔ اب پولیس پاگلوں کی طرح ڈھونڈتی پھرے گی اور تہران کوئی چھوٹا شہر تو نہیں ہے۔ پورے شہر کو چھان مارنا اور بم دھماکے کو روکنا عملاً ناممکن تھا۔

اور بچے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا اس کے لئے ضروری [illegible] ورنہ آنکھیں عمر بھر اس کا پیچھا نہ چھوڑتیں.... اسے ڈراتی رہتیں۔ اب وہ [illegible] سے رہے گا۔

دس بج کر بارہ منٹ پر وہ کیفے ٹیریا سے نکلا۔ سوا دس بجے ایک فون بوتھ کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے ایک آئیڈیا سوجھ گیا۔ وہ جلدی سے فون بوتھ میں گھسا۔ اس نے سکہ ڈالا اور ایک نمبر ملایا۔ اس نے سرگوشی میں گفتگو کی اور ریسیور رکھ کر باہر نکل آیا۔

اب وہ آزادی کی طرف پرواز کرنے والا تھا!

○

اس کے کپڑے گیلے' گرم اور چپچپے ہو رہے تھے۔ خون کی وجہ سے اور یہ جریان خون اسے موت کی طرف لے جا رہا تھا۔ سرخاب نے یہ بات سمجھ لی تھی۔ جو شخص اس کے کمرے پر قابض ہو گیا تھا' اسی نے اس کی جان بھی لے لی تھی۔ زندگی کی تو اسے اتنی پروا نہیں تھی لیکن کمرے کی تھی۔ اس کا کمرا.... وہ اس میں مرنا چاہتی تھی۔ ممکن ہے' کسی کو پتا بھی نہ چلے کہ وہ وہاں مر گئی ہے اور وہ کمرا ہی اس کا مقبرہ بن جائے۔ وہ واحد گھر تھا' جو زندگی میں اسے میسر ہوا تھا۔ اب اس کے پاس زیادہ مہلت نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ وہاں پہنچ کر ہی ابدی نیند سوئے۔ اسے جلد از جلد اپنے کمرے میں پہنچنا تھا۔

چابی اس کی داہنی مٹھی میں دبی تھی۔ اس نے خود کو گھسیٹ کر بڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی چیز رکاوٹ بن رہی تھی۔ چاقو' جو اس کی پشت میں دھنسا ہوا تھا اور اس کا ہاتھ چاقو تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ وہ رینگ رینگ کر بڑھتی رہی۔ وہ زینے سے کوئی بیس فٹ دور تھی۔ اس کے بعد زینہ! کیا وہ چڑھ سکے گی؟

سیدھا ہاتھ.... پھر الٹا ہاتھ آگے.... پھر داہنا گھٹنا.... پھر بایاں گھٹنا آگے بڑھاتی..... وہ پہنچ ہی جائے گی۔ یہ ضروری ہے۔ اس نے تصور میں خود کو دروازہ کھولتے' اندر گھس کر دروازہ بند کرتے' پھر پلنگ پر گر کے موت کا انتظار کرتے دیکھا۔

موت! موت ایک دوست کی حیثیت سے آئے گی۔ اپنے سرد مہربان ہاتھوں سے اسے چھو کر ہر اذیت سے نجات دلا دے گی۔

○

'وہ مر چکے ہیں۔ انہیں مردہ سمجھ لو۔' کمال سوچ رہا تھا۔ جنہیں سزائے

موت سنا دی جائے' انہیں تو مرنا ہی ہوتا ہے۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ باہر اخباری نمائندوں' فوٹوگرافروں اور ٹی وی والوں کا ہجوم تھا۔ دس بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔

"ہمارے پاس 80 منٹ کی مہلت ہے۔ اس بم کے سلسلے میں تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے فیروز ہمدانی سے پوچھا۔

"شہر کے ہر حصے میں بم کے ماہرین موجود ہیں۔ پولیس ہر ایمرجنسی کے لئے تیار ہے۔ اب یہ تو پتا لگانا مشکل ہے کہ دھماکا کہاں ہونے والا ہے۔ اتنا بڑا شہر ہے۔ دو گھنٹوں میں اسے چیک تو نہیں کیا جاسکتا۔"

اسی وقت ناصر اور آفاق کمرے میں آئے۔ وہ اس کے بیان پر جرح کر رہا تھا۔ تا کہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں۔ "آفاق.... آپ اس سے بات کرتے رہے ہیں' یاد کر کے بتائیں' اس نے کسی اور جگہ جانے کا تذکرہ کیا تھا آپ سے؟"

آفاق نے نفی میں سر ہلایا۔ شہباز اچھا مکینک تھا لیکن کم بولتا تھا۔ ابھی دو ہفتے پہلے وہ اس کے گیراج گیا تھا۔ جلال اس کے ساتھ تھا۔ وہ ذہن پر زور دیتا رہا۔ شاید کچھ یاد آ جائے.... شاید.... شہباز نے کچھ کہا ہو۔

ناصر کو خود پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ بار میں اس شخص کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسے بیئر بھی پلائی تھی۔ اسے اس کا بار سے رخصت ہونا یاد آ رہا تھا۔ اس نے کچھ الوداعی سی بات کی تھی۔ وہ بات کیا تھی' یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے آپ سے کہا نا' وہ بولتا بہت کم ہے...." آفاق کہہ رہا تھا۔

"ایک منٹ۔" ناصر نے مداخلت کی۔

"کیا بات ہے؟" فیروز نے ناصر سے پوچھا۔

"شہباز رخصت ہو رہا تھا تو اس نے الوداع کہا تھا سب کو۔ بتایا تھا کہ وہ کاشان جا رہا ہے۔"

"یہ تو اہم بات ہے۔"

"اس نے کچھ اور بھی کہا تھا۔" ناصر ذہن پر زور دے رہا تھا۔ چہرے پر جھنجلاہٹ تھی پھر اچانک وہ پرسکون ہو گیا "ہاں' یاد آیا۔ اس نے کہا تھا۔ کاشان تبریز تو نہیں ہے۔ میں پھر واپس آؤں گا۔ ہاں' یہی کہا تھا اس نے۔ اب میں سوچتا ہوں' شاید تبریز کا

نام نادانستگی میں اس کی زبان سے پھسل گیا ہو۔"

"یہ ابھی پتا چل جائے گا۔" فیروز نے فون ملایا اور ہدایات دینے لگا "اگر وہ تبریز جا رہا ہے تو ہم اسے پکڑ لیں گے۔"

خالد یزدانی اندر آیا اور اس نے کمال کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "نسرین تمہیں بلا رہی ہے۔ پچھلے دروازے سے چلو۔ تاکہ رپورٹروں کا سامنا نہ ہو۔"

کمال کے ہونٹوں پر پھیکی پھیکی سی مسکراہٹ ابھری "اب میں رپورٹروں سے بچنا بھی نہیں چاہتا۔"

دروازے کھلتے ہی رپورٹر اس کی طرف لپکے۔ کیمروں کے رخ بھی اس کے تھکے تھکے چہرے کی طرف ہو گئے "آقائے آفندی' آپ کے خیال میں مجرم آپ کے بچے اور شیریں پاشا کو ختم کر دے گا؟"

"وہ ایسا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔"

"یہ کوئی اتفاق ہے کہ آپ کے بچے اور خاتون پاشا کو اڑانے والا بم ٹھیک اسی وقت پھٹنا ہے' جب جواد اصغر کو پھانسی دی جائے گی۔"

"میرے خیال میں یہ اتفاق نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اغوا کا یہ مجرم میری بیوی کے قتل میں ملوث ہے۔ میں نے گورنر سے رابطے کی کوشش کی ہے اور اب آپ لوگوں کے ذریعے ان سے اپیل کر رہا ہوں کہ جواد اصغر کی سزائے موت کو موخر کر دیا جائے۔ میرے خیال میں وہ بے قصور ہے۔"

"اب سزائے موت کے متعلق آپ کی رائے میں تبدیلی تو نہیں آئی۔"

"جی نہیں بلکہ میرا موقف درست ثابت ہو گیا ہے۔ درندگی کی روک تھام سزائے موت کے بغیر ممکن نہیں۔ اب پلیز مجھے جانے دیں۔"

رپورٹرز کے پاس سے گزرتے ہوئے انہوں نے سڑک پار کی اور یزدانی ہاؤس میں داخل ہو گئے۔ نسرین یزدانی نے دروازہ کھولا اور کمال کو بچوں کی طرح لپٹا لیا۔ "کمال.... میرے بچے' تم رو لو۔ دل کا بوجھ ہلکا کر لو۔"

"میں کیا کروں؟ میں انہیں کھونا نہیں چاہتا۔" کمال نے شکستہ لہجے میں کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ نسرین اسے لپٹائے کھڑی رہی۔ وہ اس کی پیٹھ تھپکتی رہی۔ وہ

سوچ رہی تھی' کاش' مجھے پہلے یاد آ جاتا۔ اس شہباز مکینک کا خیال پہلے ہی آ جاتا۔ پچھتاوا اس کے دل میں ڈنک چبھوئے جا رہا تھا۔

"کمال' تمہیں چائے پینی ہے۔ ساتھ میں کچھ ٹوسٹ بھی لینے ہیں۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا "دو دن سے نہ تم سوئے ہو' نہ تم نے کچھ کھایا ہے ڈھنگ سے۔"

وہ اسے ڈائننگ روم میں لے گئی۔ کچن اور ڈائننگ روم کا درمیانی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کچن میں عائشہ کام کر رہی تھی۔ اسے یہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسے کمال آفندی پر ترس آنے لگا۔ اب وہ سمجھی تھی کہ گزشتہ روز اس نے اتنی بداخلاقی کا مظاہرہ کیوں کیا تھا۔ وہ بے چارہ دکھ سے نڈھال تھا کہ اس کا بچہ اغوا ہو گیا تھا۔

وہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں گئی۔ کمال اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے بیٹھا تھا "آقائے آفندی۔" اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا "چائے پی لیجئے پلیز۔"

کمال نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے مگر اگلے ہی لمحے چائے کی پیالی اڑتی ہوئی کارنس سے ٹکرائی اور چھناکے سے ٹوٹ گئی۔

"نسرین' خالد اور فیروز ہکا بکا رہ گئے۔ وہ کمال کو دیکھ رہے تھے جس نے عائشہ کا بازو سختی سے پکڑا ہوا تھا "یہ انگوٹھی تمہیں کہاں سے ملی؟" کمال چلایا "بتاؤ مجھے۔ یہ انگوٹھی تمہارے پاس کیسے ہے؟"

○

خاتون مہ وش جیل میں اپنے اکلوتے بیٹے جواد اصغر سے الوداعی ملاقات کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ بیٹے کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

جواد اصغر نے ماں کو لپٹا لیا۔

خاتون مہ وش کا دل پگھلنے لگا لیکن انہوں نے خود پر قابو رکھا۔ "بہادر بنو میرے بیٹے۔ ہمت رکھو۔" انہوں نے اسے سمجھایا۔

"میں بہادر ہوں مما۔ آقائے صادق نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آپ کا خیال رکھیں گے۔" جواد کی آواز میں لرزش تھی۔

اب خاتون مہ وش میں رکنے کا یارا نہیں تھا۔ رکتیں تو دل آنکھوں کی راہ سے بہہ نکلتا۔ وہ بیٹے کی طرف دیکھے بغیر کال کوٹھری سے نکل گئیں۔ فرید صادق' جواد کے

ساتھ تھا۔ وہ موت تک جواد کو اکیلا نہیں چھوڑے گا۔ خاتون مہ وش جانتی تھیں کہ ان کے چلے جانے میں ہی جواد کی بہتری ہے۔ ان کی غیر موجودگی اس کے لئے دشواری کو کم کردے گی۔

وہ جیل سے نکلیں اور پیدل ہی ایک طرف چل دیں۔ چند لمحے بعد ایک پولیس کار ان کے قریب آکر رکی۔ "میں آپ کو گھر پہنچا دوں خاتون۔" کسی نے کہا۔

"شکریہ۔" خاتون مہ وش نے بے حد وقار سے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئیں "مگر مجھے گھر نہیں جانا ہے۔ تم مجھے علی میاں کی درگاہ پہنچا دو۔"

درگاہ میں اس وقت سناٹا تھا۔ وہ مزار پر جا کھڑی ہوئیں "حضرت' آخری لمحوں میں میرے معصوم بچے کا ساتھ دیجئے۔" انہوں نے رقت آمیز لہجے میں کہا "وہ بہت خوف زدہ ہو گا...."

○

عائشہ کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ وہ بولنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ گرم چائے سے اس کا ہاتھ جلا تھا مگر اسے سوزش کا احساس بھی نہیں تھا۔ کمال آفندی اس کی انگلی سے وہ انگوٹھی بہت بے دردی سے اتار رہا تھا۔

کمال نے اس کی کلائی سختی سے جکڑ لی "کہاں سے ملی تمہیں یہ انگوٹھی؟" وہ پھر چلایا۔

"یہ.... یہ.... مجھے ملی تھی یہ۔"

"ملی تھی۔" فیروز نے حقارت سے دہرایا پھر کمال کی طرف مڑا "آپ کو یقین ہے کہ یہ شیریں پاشا کی انگوٹھی ہے۔"

"پورا یقین ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک ہی ہے۔ نیچے ٹٹول کر دیکھو۔ نگینے کی دو نوکیں ہیں۔"

فیروز نے انگلی ڈال کر ٹٹولا۔ اس کے چہرے پر سختی چھا گئی "خاتون عائشہ' آپ کو پوچھ گچھ کے لئے میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"اور آج صبح تم نے شہباز مکینک کا حوالہ بھی دیا تھا۔ تم صاحب اولاد ہو کر ایسے جرم میں کیسے ملوث ہوئیں۔" نسرین کے لہجے میں غصہ تھا۔

عائشہ کو لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ انگوٹھی اس کی نہیں تھی اور انگوٹھی کی وجہ سے وہ اسے اغوا کی واردات میں ملوث سمجھ رہے تھے۔ اب وہ کیسے انہیں سمجھائے.... کیسے یقین دلائے انہیں؟ "خاتون یزدانی' میں سچ کہہ رہی ہوں۔ یہ انگوٹھی مجھے میری کار میں ملی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری کار چوری ہو گئی تھی اور ایک دن پہلے ہی شہباز نے کار کی سروس کی تھی۔"

کمال نے اسے غور سے دیکھا۔ "تمہاری کار! چوری ہو گئی تھی؟"

"آقائے آفندی' یہ معاملہ مجھے سونپ دیں۔" فیروز نے کہا اور عائشہ کا ہاتھ تھام کر اسے کرسی پر بٹھا دیا "خاتون عائشہ' آپ شہباز کو کب سے جانتی ہیں؟"

"تھوڑے ہی عرصے سے۔ وہ مکینک بہت اچھا ہے۔ میں نے پیر کے دن اس سے اپنی کار لی اور فلم دیکھنے کے لئے گئی۔ ساڑھے سات بجے میں فلم دیکھ کر باہر نکلی تو کار غائب تھی۔"

"شہباز کو علم تھا کہ آپ فلم دیکھنے جا رہی ہیں؟"

عائشہ سوچتی رہی پھر بولی "جی ہاں۔ باتوں باتوں میں' میں نے اسے بتا دیا تھا پھر اس نے ٹنکی فل کر دی تھی۔"

"اور آپ کی کار ملی کہاں سے؟"

"تہران سے۔ پولیس اسے کھینچ کر تھانے لے گئی تھی۔ شاید گاڑی کسی ہوٹل سے باہر پارک تھی۔ غیر قانونی پارکنگ.... ہاں ارم ہوٹل کے باہر۔"

فیروز نے ریسیور اٹھایا اور ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملایا۔ اس نے صورت حال بتاتے ہوئے کہا "تیزی سے چیک کر کے مجھے رپورٹ دو۔" ریسیور رکھنے کے بعد اس نے بتایا "میرا ایک آدمی شہباز کی پرانی تصویر لے کر ارم ہوٹل گیا ہے۔ دعا کرو کہ کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

وہ لوگ انتظار کرتے رہے۔ کمال کا رواں رواں مصروف دعا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ فیروز نے ریسیور اٹھایا' دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر چلایا "خدایا.... میں فوراً آ رہا ہوں۔" اس نے ریسیور پٹخا اور ان لوگوں کی طرف مڑا "ہوٹل والوں نے اس کی تصویر پہچان لی ہے.... میر باز بلوچ کی حیثیت سے۔ وہ اتوار کی شام

سے وہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ آج صبح اس نے چیک آؤٹ کیا ہے۔"

"میرباز.... شہباز.... عقاب۔" نسرین نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

"کاؤنٹر کلرک نے اسے بار بار جاتے آتے دیکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے جلال اور خاتون پاشا کو وہیں کہیں قریب ہی چھپا رکھا ہے۔"

"مگر اب اس کا کیا فائدہ۔ ہمارے پاس وقت کہاں ہے۔" کمال نے مایوسی سے کہا۔

"میں نے ہیلی کاپٹر طلب کر لیا ہے۔ اگر وہ پکڑا نہ گیا تو ہم ارم ہوٹل کے قریب کا علاقہ چھان ماریں گے۔" فیروز نے کہا پھر کمال سے پوچھا "آپ چلیں گے؟"

کمال نے جواب دینے کے بجائے اپنا کوٹ اٹھا لیا۔ اس وقت ساڑھے دس بجے تھے!

○

علی میاں کے مزار کے مجاور نے خبریں سن لی تھیں۔ اب اسکی سمجھ میں آیا کہ گزشتہ رات کمال آفندی وہ عجیب پیکٹ وصول کرنے آیا تھا تو اتنا پریشان کیوں تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا "جی فرمایئے۔"

"حضرت، میں عقاب بول رہا ہوں۔"

مجاور کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا "آپ کیا....."

"کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ فون کر کے میرا پیغام کمال آفندی کو پہنچا دیں۔ اس سے کہیں کہ بم تہران کے ایک ٹرانسپورٹ کے اہم مرکز میں نصب کیا گیا ہے۔ اب وہ خود بھی کچھ قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔"

اور رابطہ منقطع ہو گیا!

○

عقاب جہاز کی طرف جانے والے رستے پر چل رہا تھا لیکن خطرے کا احساس اس کے اعصاب کو جھنجھنا رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں دبے بورڈنگ پاس کو دیکھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے مضبوطی سے رقم سے بھرے سوٹ کیس کو پکڑا ہوا تھا۔

آواز! ہاں، یہی بات تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز تھی۔ اس نے ٹکٹ چھوڑ دیا اور بورڈنگ ایریا اور کوریڈور کو تقسیم کرنے والی نیچی رکاوٹوں کو پھلانگ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دو آدمی بھاگتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی پچاس فٹ دور اسے ایک ایمرجنسی ڈور نظر آیا۔ وہ شاید ائر فیلڈ کی طرف جاتا تھا۔

لیکن وہ سوٹ کیس اٹھا کر نہیں بھاگ سکتا تھا۔ وہ صرف ایک لمحے کو ہچکچایا پھر اس نے سوٹ کیس کو پیچھے کی سمت اچھال دیا۔ سوٹ کیس فرش سے ٹکرا کر اچھلا اور کھل گیا۔ نوٹوں کی گڈیاں پورے کوریڈور میں بکھر گئیں۔

"رک جاؤ۔ ورنہ ہم تمہیں شوٹ کر دیں گے۔" کوئی عقب سے چلایا۔

اس نے ایمرجنسی ڈور کھولا، اندر گھسا اور دروازے کو بند کر دیا پھر وہ فیلڈ کی طرف بھاگا۔ وہ تبریز کے لئے جانے والے جہاز کے گرد گھوم کر دوسری طرف پہنچا۔ وہاں جہاز کے بائیں بازو کے قریب ایک چھوٹی سی سروس وین کھڑی تھی۔ اس کا انجن رواں تھا۔ ڈرائیور اس میں بیٹھ ہی رہا تھا۔ عقاب نے اسے پیچھے سے دبوچا اور بڑی بے رحمی سے اس کی گدی پر گھونسا رسید کیا۔ وہ ایک چیخ مار کر ڈھیر ہو گیا۔ عقاب نے اسے نیچے دھکیلا اور خود وین میں کود گیا۔ اس نے ایکسی لیٹر دبایا۔ وین جہاز سے دور ہوتی گئی۔

وہ جانتا تھا کہ کسی بھی لمحے پولیس کار میں اس کا تعاقب شروع کر دے گی لیکن وہ اسے ٹرمینل میں نہیں تلاش کرے گی۔ اس نے گاڑی ایک ہینگر کے قریب روکی اور اس سے اتر آیا۔ اس نے وین سے کارکردگی والی کتاب نکال لی۔ سامنے ایک دروازہ تھا، جس پر..... صرف متعلقہ افراد کے لئے.... لکھا تھا۔ اس نے کارکردگی والی کتاب کھولی اور اس کا جائزہ لینے کی اداکاری کرتا ہوا اس دروازے میں گھس گیا۔ یہاں اس کا انداز افسروں والا ہو گیا۔

چند لمحے بعد وہ باہر نکلا اور گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو روک لیا۔ اس نے جیب سے سو تومان کے آخری دو نوٹ نکالے اور ڈرائیور کی طرف بڑھائے "تمہیں تیز رفتاری دکھانی ہو گی۔ مجھے سینٹرل ریلوے اسٹیشن پہنچ کر ساڑھے گیارہ بجے والی ٹرین

پکڑنی ہے۔"

"کام تو مشکل ہے جناب لیکن میں کوشش کروں گا۔ سنبھل کر بیٹھیں۔" ڈرائیور نے کہا۔

وہ کار میں بیٹھ گیا۔ اس کا جسم پسینے میں تر تھا۔ اسے شیریں پر غصہ آنے لگا۔ یہ سب شیریں کا قصور ہے اسے کل ہی اس کا گلا گھونٹ دینا چاہئے تھا۔ وہ اس سے جھوٹی محبت جتا رہی تھی اور پھر اس نے اس کا ریوالور نکالنے کی کوشش کی تھی۔ عورت ہے ہی بری مخلوق۔ عورت کیسی ہی ہو، کہیں بھی ہو، معزز ہو یا اس کے جیسی، اس نے ہمیشہ اسے دھتکارا تھا۔ اس کی توہین، تذلیل کی تھی۔ کسی نے اسے پیار نہیں دیا تھا۔ عورتیں ہوتی ہی بری ہیں لیکن شیریں تو بدترین تھی۔

اب بم شیریں کو ختم کر دے گا لیکن وہ اس سے بری موت کی مستحق ہے۔ بم تو آسان موت ہو گا۔ اسے تو اپنے گلے پر اس کے ہاتھوں کی گرفت محسوس کرنی چاہئے۔ ایسے تو مزہ نہیں آئے گا۔ وہ اس کے چہرے پر خوف دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اسے گڑگڑاتے، گھگیاتے ہوئے سننا چاہتا ہے اور اس دوران میں وہ اس کا گلا دبائے تو اس کا لطف ہی کچھ اور ہو گا۔

وہ لذت میں ڈوب گیا۔ یہ تصور ہی اس کے لئے بے حد لذت انگیز تھا۔ اس پر عمل کرنے میں تو لطف ہی اور ہو گا۔

اگر وہ گیارہ پچیس پر بھی کمرے میں پہنچ گیا تو اس کے پاس خاصا وقت ہو گا۔

آگے سڑک بند تھی۔ ڈرائیور نے کہا "لگتا ہے، کچھ سڑکیں بند کر دی گئی ہیں۔"

عقاب اس کی وجہ جانتا تھا۔ وہ خاموشی سے ٹیکسی سے اتر گیا۔ وہاں ہر طرف پولیس والے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں راستہ بناتا آگے بڑھتا رہا۔ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ کہیں بم رکھے جانے کی اطلاع ملی ہے۔ کیا انہوں نے جلال اور شیریں کو تلاش کر لیا ہے؟ اس خیال نے ہی اس کے وجود کو غصے اور نفرت کی آگ سے بھر دیا۔

"پیچھے کھڑے رہیں۔ آپ آگے نہیں جا سکتے۔" ایک پولیس والے نے اسے پیچھے دھکیلا۔

"بات کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بم کی گمنام کال۔ ہو سکتا ہے کہ جھوٹی ہو۔"

اس سے زیادہ کون جان سکتا تھا کہ کال سچی ہے۔ وہ اسی کی تو فون کال تھی۔

بہرحال اسے یہ پتا چل گیا کہ وہ ابھی تک ان دونوں تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ اس کے جسم میں سرشاری دوڑنے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں وہ اینٹھن ہونے لگی، جو کسی حسین عورت کا گلا گھونٹتے وقت ہوتی تھی۔ جب اسے یقین ہوتا تھا کہ اب اسے کوئی اس کے ہاتھوں سے نہیں بچا سکتا۔

"میں سرجن ہوں۔" اس نے پولیس والے سے کہا "میری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ مجھے ایمرجنسی اسکواڈ میں شامل ہونا ہے۔"

"سوری ڈاکٹر، آپ چلے جائیں۔" پولیس والے نے اسے راستہ دے دیا۔

راستہ صاف تھا وہ دوڑتا چلا گیا۔ وہ ٹرمینل میں داخل ہوا تو گیارہ بج کر بائیس منٹ ہوئے تھے۔ ٹرمینل سے لوگوں کو باہر نکالا جا رہا تھا۔ ایک پولیس والے نے اندر جاتے دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا "آپ اندر نہیں جا سکتے۔ مجھے طلب کیا گیا ہے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ پولیس والے نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اندر پولیس والے ادھر ادھر تلاشی لیتے پھر رہے تھے۔ لگتا تھا، پورے شہر کی پولیس اسٹیشن پر موجود ہے۔ اسے فخر کا احساس ہونے لگا۔ اس نے خود کو ان سب سے زیادہ چالاک ثابت کر دیا ہے۔ انفارمیشن کاؤنٹر کے قریب کچھ لوگ جمع تھے۔ چوڑے کندھوں والا ایک دراز قامت شخص نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ وہ کمال آفندی تھا۔

عقاب نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اب بس دو منٹ کی بات تھی۔ اس کی انگلیاں اینٹھ رہی تھیں۔ وہ نچلے لیول پر پہنچا۔ اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ زاہدان جانے والی ٹرین کا پلیٹ فارم سنسنان پڑا تھا....

○

درگاہ سے موصول ہونے والا عقاب کا پیغام فیروز ہمدانی اور کمال آفندی کو ہیلی کاپٹر میں موصول ہوا "اس زمرے میں تو ائرپورٹ، ریلوے اسٹیشن، بس ٹرمینل، سبھی کچھ آ جاتا ہے۔" فیروز نے تبصرہ کیا "کیا تم یہ سب خالی کرا رہے ہو؟"

کمال کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں "تم کہاں سے اسٹارٹ کرو گے؟"

"سینٹرل ریلوے اسٹیشن سے۔ یاد نہیں' وہ ارم ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور ارم ہوٹل اسٹیشن کے سامنے ہی ہے۔ یہ بھی نہ بھولئے کہ آقائے اسفندیار نے کیسٹ سننے کے بعد بتایا تھا کہ وہ کوئی ایسی جگہ ہے' جہاں سے ٹرینیں گزرتی ہیں۔"

"اور جواد اصغر کا کیا ہو گا؟"

"اگر ہم اصل مجرم سے اعتراف جرم نہ کرا سکے تو جواد اصغر بچ نہیں سکے گا۔"

گیارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ ہیلی کاپٹر سے اترے تو فیروز کو اس کے ایک ماتحت نے عقاب کے بچ نکلنے کی کہانی سنا دی "تمہیں یقین ہے کہ وہ وہی تھا؟" فیروز نے پوچھا۔

"وہ رقم کا سوٹ کیس پھینک کر بھاگا تھا۔" ماتحت نے کہا "ائر پورٹ خالی کرا لیا گیا ہے۔ فیلڈ پر اور ٹرمینل پر اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔"

"اسے پکڑنا اور اعتراف جرم کرانا ضروری ہے۔" فیروز نے سخت لہجے میں کہا۔

کمال کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ عقاب بچ نکلا تھا۔ اب شیریں اور جلال کا کیا ہو گا۔ ان کے درمیان وہ کیسٹ آخری رابطہ ثابت ہو گا۔ وہ کیسٹ جس میں نازنین کی آواز بھی ہے!

اچانک ایک خیال کے تحت اس نے فیروز کا بازو دبوچ لیا "وہ جو کیسٹ اس نے بھیجا تھا....." اس نے نازنین کی آواز اس میں ڈب کی ہو گی۔ ممکن ہے' اس کے پاس اور کیسٹ ہوں جن میں نازنین کی.... اور دوسری عورتوں کی آوازیں ہوں۔"

فیروز تیزی سے اپنے ماتحت کی طرف پلٹا "اس کا سامان کہاں ہے؟"

"وہ جہاز میں ہے اور جہاز روانہ ہو چکا ہے۔" فلائٹ لیٹ روانہ ہوئی پھر بھی جہاز کو ٹیک آف کئے دس منٹ ہو چکے ہیں۔" ماتحت نے جواب دیا۔

"اس جہاز کو واپس بلاؤ اور اس کا سامان نکال کر چیک کرو۔ فوراً....." فیروز چلایا۔

شاہ کی خصوصی پولیس کے پاس اختیارات تھے۔ طیارے کے کیپٹن کو واپسی کا حکم دے دیا گیا۔ فیروز نے جیل کے حکام سے رابطہ کیا "ہم جواد اصغر کی بے گناہی کا ثبوت تلاش کر رہے ہیں آخری لمحے تک اپنی لائن ہمارے لئے اوپن رکھنا۔" اس نے وارڈن سے کہا۔

پھر اس نے گورنر کو فون کیا مگر اس کے سیکرٹری سے بات ہو سکی "گورنر صاحب کی گورنر ہاؤس میں موجودگی کو یقینی بنایئے اور ائر پورٹ پر ہمارے آدمیوں کے لئے اور دوسری طرف جیل حکام کے لئے لائنیں اوپن رکھئے۔" اس نے سیکریٹری سے درخواست کی۔

پھر انہوں نے سڑک پار کی اور اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ لاؤڈ اسپیکر پر ایک آواز اناؤنس کئے جا رہی تھی "اسٹیشن کو خالی کر دیجئے۔ اسٹیشن کی حدود سے نکل جایئے۔"

اسٹیشن کے بالائی لیول پر انفارمیشن کاؤنٹر پر انجینئرز اسٹیشن کے نقشوں پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ سرچ پارٹیز کو ہدایات جاری کر رہے تھے۔ "ہم نے تمام پلیٹ فارم چیک کر لئے ہیں۔" ایک انجینئر نے فیروز ہمدانی کو بتایا "اب لاکر چیک کئے جا رہے ہیں۔"

"بم اسکواڈ والوں نے بم سے بچاؤ والے کمبل تقسیم کر دیئے ہیں۔" دوسرے انجینئر نے بتایا "یہ کمبل دھماکے کی صورت میں 90 فیصد موثر ثابت ہوتے رہے ہیں۔"

کمال کی نگاہیں ٹرمینل کا جائزہ لے رہی تھیں۔ لاؤڈ اسپیکر آف کر دیئے گئے۔ اب وہاں سناٹا تھا۔ اس نے کلاک کی طرف دیکھا۔ گیارہ اکیس.... گیارہ بائیس..... گیارہ تیئس سوئی مسلسل حرکت میں تھی۔ اس نے سر گھمایا۔ اسے بھی کچھ کرنا چاہئے۔ اس کی نظر چوڑے کندھوں والے ایک شخص پر پڑی' جو نچلے لیول کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ اسے کچھ جانا پہچانا لگا تھا۔ ممکن ہے' کوئی شناسا پولیس والا ہو۔

لاؤڈ اسپیکر پر آواز ابھری "گیارہ بج کر تیئس منٹ ہو چکے ہیں۔ براہ کرم لوگ ٹرمینل خالی کر دیں۔"

"نہیں.... میں جاؤں گا۔" کمال نے کہا۔

فیروز نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آقائے آفندی' بم دھماکے کی صورت میں ہم سب ہلاک بھی ہو سکتے ہیں۔"

کمال نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "مجھے چھوڑ دو میرا پیچھا چھوڑ دو۔" وہ چلایا۔

اب کوئی فائدہ نہیں۔' شیریں نے سوچا۔ اس کی نظریں بم سے منسلک گھڑی پر جمی تھیں۔ وہ دروازے کے ٹوٹے ہوئے ہینڈل سے ڈوری کو کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چپچپے پن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی کلائیاں زخمی ہو گئی ہیں لیکن اسے تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔

خون میں بھیگ کر ڈوری نرم ہو گئی تھی۔ وہ ایک گھنٹے سے اس کوشش میں مصروف تھی۔ اب دس بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ جلال کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

گیارہ بج کر دس منٹ پر اسے ڈوری کے ڈھیلے پڑنے کا احساس ہوا۔ اس نے بچی کھچی توانائی استعمال کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو مخالف سمتوں میں کھینچا۔ اگلے ہی لمحے خوش گوار حیرت نے اسے بے جان کر دیا۔ اس کے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں کو ملتی رہی۔ وہ سن تھے۔

خود کو بائیں کہنی پر ٹکاتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھی۔ اس کے پاؤں پلنگ سے باہر لٹک گئے۔ ٹخنے میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ کمزوری کی وجہ سے اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ وہ منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس سے گرہ نہیں کھولی جا رہی تھی اور اب ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

بالآخر وہ کامیاب ہو گئی۔ کپڑا منہ سے نکال کر اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اب اس کے پاس صرف تیرہ منٹ تھے۔

اب بھی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ چل نہیں سکتی تھی۔ اس نے جلال کے ہاتھ کھول دیئے اور منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔

اسی لمحے اسے دروازے کی جانب سے عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ گھبرا گئی۔ کیا وہ واپس آ گیا ہے۔ جلال کو خود سے لپٹا کر وہ بند دروازے کو تکتی رہی۔ پھر بہت دھیرے دھیرے دروازہ کھلنے لگا پھر سوئچ دبا اور روشنی ہو گئی۔

شیریں نے جو کچھ دیکھا' وہ اسے حقیقت نہیں لگا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی' جس کی آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔

عورت ان کی طرف بڑھی۔ جلال سہم کر شیریں سے لپٹ گیا۔ عورت فرش پر ڈھیر ہو گئی "میری پیٹھ میں چاقو گھسا ہوا ہے۔" وہ ڈوبتی آواز میں گڑگڑائی "میں بہت تکلیف میں ہوں۔ پلیز.... چاقو نکال دو.... بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ میں یہاں مرنا چاہتی ہوں۔"

بوڑھی عورت کا سر شیریں کے پیروں پر ٹک گیا۔ شیریں نے دیکھا کہ وہ بڑا چاقو دستے تک اس کی پشت میں دھنسا ہوا ہے۔ اسے خیال آیا کہ اس چاقو کی مدد سے وہ اپنے اور جلال کے پیروں کی ڈوری کاٹ سکتی ہے۔ اس پر تھرتھری چڑھنے لگی مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے چاقو کا دستہ تھاما اور چاقو کو کھینچ لیا۔

بوڑھی عورت اذیت سے بے حال ہو کر رونے لگی۔

شیریں نے تیزی سے جلال کی بندشیں کاٹ ڈالیں "جلال.... تم یہاں سے بھاگو اور چلاؤ کہ یہاں دھماکا ہونے والا ہے۔" اس نے جلال سے کہا "آگے پلیٹ فارم ہے۔ اس سے آگے اوپر جانے والی سیڑھیاں ہیں۔ ان سے اوپر جاؤ۔ وہاں تمہیں لوگ نظر آئیں گے۔ ان سے مدد مانگو۔ جاؤ.... یہاں سے نکل جاؤ۔"

"آنٹی.... آپ کا کیا ہو گا؟" جلال نے پریشانی سے پوچھا۔

"تم چلے جاؤ۔ جلدی کرو.... بھاگو۔"

جلال ہچکچایا مگر بالآخر کمرے سے نکلا۔ وہ بم سے خوف زدہ تھا۔ کاش مدد مل جائے اور شیریں آنٹی کو بچایا جا سکے۔

زینے سے اتر کر وہ سوچنے لگا کہ کس طرف جائے پھر وہ پھسلواں راستے کی چڑھائی پر لپکا۔ پلیٹ فارم بھی تھا اور اس کے آگے سیڑھیاں بھی تھیں۔ جیسا کہ شیریں آنٹی نے کہا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو اسے اوپر سے نیچے اترتے ہوئے قدموں کی چاپیں سنائی دیں۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی اور اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے سوچا' اس آنے والے کو شیریں آنٹی کے متعلق بتائے گا۔

لیکن اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ چہرہ نظر آیا جو اسے خوابوں میں ڈراتا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بڑے آدمی کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے جلال کی طرف ہاتھ بڑھائے....

جلال اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے لات بھی چلائی۔ لات برے آدمی کو لگی اور وہ گر کر تین سیڑھیوں سے لڑھکا۔ جلال اندھا دھند اوپر کی طرف بھاگا۔ اوپر ہر طرف ویرانی تھی۔ کہیں کوئی نہیں تھا' جس سے وہ مدد مانگتا۔ جبکہ برا آدمی شیریں آنٹی کی طرف گیا تھا۔

جلال سسکیاں بھرتے ہوئے ایک اور زینے پر چڑھنے لگا۔ وہ چیخ کر بابا جانی کو پکارنا چاہتا تھا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اسے وہاں بے شمار پولیس والے نظر آئے جو مختلف سمتوں میں دوڑ رہے تھے۔ دو پولیس والے ایک آدمی کو باہر کی طرف دھکیل رہے تھے.... ارے.... یہی تو بابا جانی ہیں۔

"بابا جانی۔" وہ پوری قوت سے چلایا پھر جسم کی بچی کھچی توانائی جمع کر کے ان کی طرف دوڑا۔

کمال نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کی بانہوں میں تھا۔

"بابا جانی۔" جلال نے سسکیوں کے درمیان کہا "وہ برا آدمی شیریں آنٹی کو مارنے والا ہے۔ جیسے اس نے ماما کو مارا تھا۔"

○

شاہین باہر نکالے جانے کے خلاف جدوجہد کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سرخاب نیچے ہے۔ انفارمیشن کاؤنٹر پر اسے فیروز ہمدانی نظر آیا۔ اسپیشل پولیس کا مہربان افسر' جو ہمیشہ اس سے بہت مہربانی سے بات کرتا تھا۔ وہ اس کی طرف لپکی اور اس کا ہاتھ تھام لیا "آقائے ہمدانی' وہ سرخاب ہے نا...."

فیروز نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا "شاہین' یہاں سے نکل جاؤ۔"

لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی "نہیں آقائے ہمدانی۔" شاہین سسکنے لگی۔

فیروز ہمدانی ایک دراز قامت شخص کو دھکیل رہا تھا۔ اچانک ایک بچہ زور سے چلایا "بابا جانی.... بابا جانی...."

شاہین نے گھوم کر دیکھا۔ دراز قامت شخص بچے کی طرف لپکا۔ بچہ باپ کو کسی برے آدمی کے متعلق بتا رہا تھا۔

بچہ رو رہا تھا "بابا جانی.... شیریں آنٹی کو بچالیں اور وہاں ایک بوڑھی عورت بھی

ہے.... زخمی...."

"کہاں بیٹے؟ مجھے بتاؤ۔"

"زخمی بوڑھی عورت۔" شاہین چلائی۔ "یہ سرخاب ہے.... وہ اپنے کمرے میں ہو گی۔ آقائے ہمدانی' وہ پرانا ڈش واشنگ والا کمرا تھا نا روشن ریستوران کا۔"

"چلو.... جلدی کرو۔" فیروز نے چیخ کر کہا۔

کمال نے جلال کو ایک پولیس والے کی طرف دھکیلا۔ "میرے بیٹے کو باہر لے جاؤ۔" پھر وہ بھی فیروز کے پیچھے لپکا۔ دو آدمی نائیلون کی ایک بھاری شیٹ لئے فیروز کے پیچھے چل رہے تھے۔

کسی نے شاہین کو بھی باہر دھکیل دیا۔

○

بوڑھی عورت کی کراہیں' رکیں جاری ہوئیں پھر کچھ دیر تک رکی رہیں۔ شیریں نے جھکتے ہوئے اس کے سر کو تھپتھپایا۔ اس کی پیشانی سہلاتے ہوئے اس کو سردی کا احساس ہوا۔ بوڑھی عورت کی پیشانی سرد ہو رہی تھی پھر اس کے جسم میں لرزہ سا دوڑا اور اس کے ساتھ ہی اس کی کراہیں تھم گئیں۔

شیریں سمجھ گئی کہ وہ مر چکی ہے اور اب اس کی باری تھی "مجھے تم سے محبت ہے کمال۔" اس نے بلند آواز میں کہا "اس نے آنکھیں موند لیں تو کمال کا چہرہ اس کے تصور میں ابھر آیا "میری ہٹ دھرمی پر مجھ معاف کر دینا۔"

قدموں کی چاپ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ دروازے میں اسے عقاب کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ گلا گھونٹنے کے انداز میں آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ انگوٹھوں کی اینٹھن واضح طور پر نظر آ رہی تھی پھر وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔

○

نچلے لیول کی طرف جاتے ہوئے فیروز ہمدانی سب سے آگے تھا۔ کمال اس سے ایک قدم پیچھے تھا اور بم سے بچاؤ کا کمبل اٹھائے بم اسکواڈ کے دو آدمی ان کا ساتھ دینے کی بھرپور مگر ناکام کوشش کر رہے تھے۔

وہ پھسلواں راستے پر تھے کہ انہیں نسوانی چیخیں سنائی دیں۔ "نہیں.... خدا کے لئے.... کمال' مجھے بچاؤ.... کمال...."

کمال کا وجود ایک نامعلوم توانائی سے بھر گیا۔ بروقت شیریں تک پہنچنے کی خواہش نے اسے پاگل کر دیا۔ وہ یوں دوڑا کہ فیروز بھی پیچھے رہ گیا۔

"کما.... آ.... آ.... آ... آ..." اگلی چیخ گھٹ کر رہ گئی تھی۔

کمال تیزی سے سیڑھیاں چڑھا اور اس نے پوری قوت سے دروازے کو دھکیل کر کھول دیا۔ اندر کا منظر ڈراؤنے خواب جیسا تھا۔ فرش پر پڑی ہوئی لاش' نیم دراز شیریں کے بندھے ہوئے پیر۔ وہ اپنے اوپر جھکے ہوئے شخص کے خلاف مزاحمت کر رہی تھی۔ وہ اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔

کمال نے اس شخص کی پیٹھ پر پوری قوت سے ٹکر ماری۔ وہ آگے کی طرف گرا۔ کمال اس کے اوپر تھا۔ وہ دونوں شیریں کے اوپر تھے۔ ان کے وزن سے پلنگ ڈھے گیا اور وہ فرش پر لڑھک گئے۔

شیریں کے گلے پر سے شہباز کے ہاتھ ہٹ گئے۔ شہباز لڑکھڑاتا ہوا اٹھا لیکن سرخاب کی لاش سے ٹھوکر لگنے کی وجہ سے گر گیا۔

ادھر شیریں اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔

فیروز دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ شہباز کو احساس ہوا کہ وہ گھر چکا ہے۔ وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کا ہاتھ ٹوائلٹ کے دروازے سے ٹکرایا۔ وہ جلدی سے کھول کر ٹوائلٹ میں گھس گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے چٹخنی چڑھا دی۔

"پاگل آدمی' باہر آ جاؤ۔" فیروز نے چیخ کر کہا۔

بم ڈسپوزل والے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے سوٹ کیس کو نائیلون کی شیٹ سے ڈھانپ دیا۔

کمال نے شیریں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شیریں کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس کے گلے پر انگلیوں کے بدنما نشانات ابھر آئے تھے لیکن وہ زندہ تھی۔ دروازے کی طرف مڑتے ہوئے اس کی نظر دیوار پر چسپاں نازنین کی آخری..... تصویر پر پڑی۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس نے شیریں کو بھینچ لیا۔

فیروز' سرخاب پر جھکا ہوا تھا "وہ مر چکی ہے۔"

گھڑی کی بڑی سوئی چھ کی طرف بڑھ رہی تھی "نکلو یہاں سے۔" فیروز نے چیخ کر کہا "سرنگ کی طرف لپکو۔"

وہ گرتے پڑتے زینے سے اترے۔ جنریٹر کے پاس سے گزرے۔ ریلوے لائن کے پاس سے....

عقاب نے جاتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنی تو دروازہ کھول کر نکلا۔ سوٹ کیس پر پڑی نائیلون کی شیٹ کو دیکھ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ وہ تو اب بچ نہیں سکتا لیکن وہ لوگ بھی نہیں بچیں گے۔ آخری فتح اسی کی ہو گی۔

وہ جھک کر نائیلون کی شیٹ کو سوٹ کیس پر سے ہٹانے لگا۔ اس لمحے بجلی سی چمکی دھماکا ہوا اور اس کا وجود عدم میں تبدیل ہو گیا۔

○

گیارہ بج کر بیالیس منٹ پر فرید صادق علی میاں کی درگاہ میں داخل ہوا۔ اس لمحے نماز پڑھتی ہوئی خاتون مہ وش نے سلام پھیرا "سب ختم ہو گیا؟" خاتون مہ وش نے پوچھا۔ ان کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔

"جی ہاں اماں۔ سب ختم ہو گیا۔ میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو اپنے بیٹے کو گھر لے کر جانا ہے۔" فرید صادق نے کہا۔

"اس کی تدفین....."

"نہیں اماں۔ قاتل کے خلاف ناقابل تردید ثبوت ملنے کے بعد صرف ایک منٹ پہلے گورنر نے جواد کو رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ قاتل کے پاس اپنے ہر جرم کا آڈیو کیسٹ بھی تھا اور تصویریں بھی۔"

بوڑھی خاتون کا چہرہ چمکا اور دیکھتے ہی دیکھتے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی لیکن وہ شکر کے بے آواز آنسو تھے پھر وہ ان آنسوؤں کے درمیان بولیں "ذرا رک جاؤ۔ میں شکر کے دو نفل تو پڑھ لوں پھر چلوں گی۔"

حالانکہ وہ اڑ کر بیٹے کے پاس چلی جانا چاہتی تھیں مگر انہوں نے شکر کے دو نفل کی نیت باندھ لی۔ فرید صادق اس کے پاس کھڑا اسے تکتا رہا۔

○

فیروز ہمدانی نے روتی ہوئی شاہین کے سر پر دلاسا دینے کے لئے ہاتھ رکھا "روؤ مت میری بہن۔ خاتون نے کتنے لوگوں کو بچا لیا۔ اس اسٹیشن کو تباہی سے بچا لیا۔ میں گورنر سے سفارش کروں گا کہ ویٹنگ روم کے باہر ان کے نام کی یادگار نصب کی جائے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کا افتتاح بھی گورنر صاحب کریں گے۔"

شاہین کے آنسو تھم گئے۔ "خاتون سرخاب کی یادگار۔" اس نے سرگوشی کی " خاتون سرخاب کی روح کو سکون ملے گا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ وہ بہت اچھی' بہت دکھی' اور بہت تنہا عورت تھی۔"

○

اسے اپنے اوپر ایک تیرتا ہوا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ مرنے والی تھی اور اب وہ کمال کو کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ "نہ..... نہیں...." وہ منمنائی۔

"ڈرو نہیں جانم۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

وہ کمال کی آواز تھی۔ کمال کی! اور وہ چہرہ بھی کمال کا تھا۔

"سب ٹھیک ہو گیا جانم۔ ہم اسپتال جا رہے ہیں۔ تمہیں ٹھیک ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"اور جلال....؟"

"میں یہاں ہوں آنٹی۔" ایک ننھا منا ہاتھ اس کے ہاتھ کو سہلانے لگا "آنٹی' آپ کے کہنے کے مطابق میں تمام وقت اس تحفے کے متعلق سوچتا رہا' جس کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ اب مجھے بتائیں' آپ کے پاس کتنی کھلونا ٹرینیں ہیں....؟"

○ ○ ○

(ختم شد)